المنار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وممن خلقنا امة یهدون بالحق وبه یعدلون

— قرآن کریم ۔ سورہ اعراف —

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

جلد ۸	نومبر دسمبر ۱۹۵۸ء	شمارہ ۱-۲

نگران اعلیٰ

شیخ محبوب عالم خالد

ایم۔اے

مدیر اعلیٰ

لطف الرحمٰن محمود

معاون مدیر

مہر اللہ یار

فہرست

مستقل کالم

اداریے — مدیر اعلیٰ
چاند ستارے
چشم بد دور
دور پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

مقالات و مضامین

میر درد کی صوفیانہ شاعری کا ایک محبوب موضوع — لطف الرحمٰن
غالب کی شاعری — عبدالصمد یار
شاعری — سید احمد مجیب
" الفساد " — حکیم اللہ خان ناصر

[illegible]

حقیقت مومن کی داستان بیش معلم — جناب شیخ ... دانا پوری
شیخ ... کا طالب علم ... — جناب رضا بریلوی

[illegible]

تغزل کا تغزل — خلیل الرحمٰن رامپوری
غزل — حمید ...
مرے خیال دیکھ — محمد اکرام خان

[illegible]

پنجابی سخن — فضل الرحمٰن خلیل
آزاد سخن — کمال احمد ...
اے غزال چمن — ظفر
آتش دل — محمود الشیبانی

تراجم

ہواؤں سے روح — فرشتہ ...
پس پردہ — منظور ...
افکار — قاصد ظریف

اشعار

یادی قوس — اے ... بدوانی
افسانہ نوی ادب — حکیم کوہستانی
اشک ... — لطف الرحمٰن ...
نیچاری — سید سجاد
طنز و مزاح
ضرورت رشتہ
تکیہ کلام

متفرقات

اداریہ

خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

توہم گرما کی تعطیلات کے بعد المنار کا پہلا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ نامساعد حالات کے باوجود ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ کہ زیر نظر شمارہ ہر لحاظ سے دلچسپ اور جاذب نظر ہو۔ اسے اب اگر آپ کی نگاہِ تلطف نے قبولیت سے مشرف کیا۔ تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری حقیر کاوشیں رائیگاں نہیں گئیں!

اس جریدہ کا مقصد اولین یہی ہے کہ طلبہ کی خفتہ فطری استعدادوں کو بیدار کر کے ان میں قوت تحریر پیدا کی جائے۔ اور ذہنی جلا کا سامان مہیا کیا جائے۔ حتی الوسع نیک نیتی اور نہایت فراخدلی سے نوخیز ادیبوں کی طرف سے موصول ہونے والے فن پاروں کو شریک اشاعت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ طلبہ کے عام علمی اور ذہنی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ناقدانہ تعزیروں کے گرز برداروں سے ان کی تخلیقات کا گلا نہیں گھونٹا گیا۔ اس ترمیم اور لچک کی وجہ سے یقیناً کمزوری رہ گئی ہوگی۔ ہمارے ناقدین بھی اگر اس امر کو ملحوظ نظر رکھیں کہ یہ طلبہ اور صرف طلبہ کا رسالہ ہے۔ تو ہمیں یقین ہے۔ کہ ذہن کی عالی ظرفی کا طلسم ناپختگی اور احساس سطحیت کی ٹھوکر سے پاش پاش ہونے سے بچ جائے گا۔ ہمارے نزدیک۔ خدمت ادب کے سلسلہ میں باذوق طالب علم کی ابتدائی مخلصانہ کاوش کی عظمت کا تحفظ ناقدانہ تعزیروں کے پٹے ہوئے مہروں کے تقدس سے زیادہ عزیز ہے۔ ممکن ہے کہ ان نو واردانِ دشتِ ادب میں سے بھی کوئی سرمنزل کامرانی کا چراغ روشن کر سکے۔ ع تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد؟

مگر ہم نے اس التزام میں جذباتیت کو ہرگز نہیں اپنایا بلکہ ساتھ ساتھ معیار بلند کرنے کی بھی کوشش جاری رکھی ہے اور غالباً یہی سبب ہے زیادہ تر ملی کیفیت ہے۔ المنار کی بنیادیں تجارتی اغراض یا تنقیدی اقدار کے شطرنج پر استوار نہیں کی گئی تھیں۔ المنار کا مسلک یہی ہے کہ طلبہ کے خیالات کو گمراہ کن فرقہ وارانہ پگڈنڈیوں پر بھٹکتے پھرنے کی بجائے موزوں اور منفعت بخش ڈگر پر گامزن کیا جائے۔ ان میں علمی تجسس، دینی تحقیق و تدقیق کا مادہ پیدا کر کے سنجیدہ نگاری پر مائل کیا جائے اور دورِ حاضر کی خطرناک مادیت کے ہوش ربا شعلوں کی بربادیوں سے باخبر رکھتے ہوئے انہیں اسلامی نظریات اور اقدار کا علمبردار بنایا جائے۔

المنار طلبہ کا رسالہ ہے اسے طلبہ ہی کے ذہنی رجحانات کا آئینہ دار اور ان کی قلمی کاوشوں کا مرقع ہونا چاہیئے۔ طلبہ کی خواہش کے پیش نظر صرف دو تین صفحات کو اساتذہ کرام کے افکار عالیہ کی اشاعت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے ویسے عام کالجوں کے جرائد کے برعکس اس "بدعت" سے پاک رکھنے کی کوشش جاری رکھی جائیگی۔ طلبہ سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ باذوق طلبہ انشاء اللہ المنار کے دامن کو اپنے قلم سیال کی جولانگاہ پائیں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے طلبہ اپنے محبوب رسالہ کا معیار بلند کرنے کیلئے دست تعاون دراز کریں گے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ طلبہ کے تخیل کی بلند پروازیاں اور قلم کی جولانیاں المنار کو اپنے اور صرف اپنے لئے مخصوص کر سکتی ہیں۔ کیا ہم توقع رکھیں کہ اگلا شمارہ خالصتاً طلبہ کی بلند پایہ نگارشات کا رہین منت ہوگا؟ محمود

سیلانی

جائزے

خوش آمدید | تعطیلات کے بعد جب سے کالج کھلا ہے سیلانی اَن گِنت نئے چہروں کی زیارت سے مشرف ہوا ہے۔ اس درسگاہ میں اکتسابِ علم کی نیت سے قدم رکھنے والے نوواردوں کو سیلانی خوش آمدید کہتا ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

جہاں تک ظاہری حرکات و سکنات کا کردار بینی سے تعلق ہے سیلانی دعویٰ کر سکتا ہے کہ مجموعی طور پر بڑی حد تک ذہنی اور جسمانی اعتبار سے مستقبل حوصلہ افزا ہے۔ مگر سیلانی کے دوستوں کے اعصاب پر ان خیالات کے اظہار کے بعد کسی خطرناک قسم کی خوش فہمی کا اثر نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ سیلانی کا بلند دوکان والا یہ پکوان خدانخواستہ پھیکا ہی رہ جائے گا۔ ایک بات جس کی اطلاع سیلانی چپکے چپکے اپنے قارئین کو دینا چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس عظیم درسگاہ میں اسلامی روح کے احیاء اور تحفظ کی حتمی کوشش کی جاتی ہے۔ طلبہ سے اسلامی شعائر کے اپنانے کی نہ صرف توقع کی جاتی ہے۔ بلکہ اُن پر عمل بھی کرایا جاتا ہے۔ کالج کی درخشندہ روایات کو خفیف سا نقصان بھی پہنچانے والے آزاد منش حضرات کو تو ہجرت ہی کرنی پڑتی ہے۔ سیلانی اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہے۔ بس۔ بگوشِ ہوش سنو ہم سنائے دیتے ہیں!

انتخاب | تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ سیلانی ریاضی کے پیریڈ سے نڈھال ہو کر لان میں گھاس پر لیٹنے لگا۔ ابھی پوری طرح انگڑائی بھی نہ لی تھی۔ کہ اچانک دیکھتا ہے کہ ہاسٹل۔ دارالمطالعہ۔ لیکچر روموں۔ برآمدوں۔ چھتوں۔ سیڑھیوں سے طلبہ کو پکار پکار کر ہنگامی طور پر ہال میں جمع ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ سیلانی نے بھی "حقِ تنظیم" ادا کرتے ہوئے بقیہ انگڑائی ہال میں ہی جا کر پوری کی۔ [illegible]

"قراردادِ تعزیت" ضرور ہے۔ یا پھر۔ ڈچ۔ ڈینش جرمن انگلش یا امریکن وزیر، سفیر کی اچانک آمد ہے۔ مگر افسوس کہ عین چوراہے بڑی یاس کے عالم میں یہ بھانڈا اس وقت پھوٹا جب محترم صوفی صاحب کی "تعارفی بلکہ ہدایاتی تقریر" کے ڈانڈے انتخاب اور ووٹ کی اہمیت سے جا ملے۔! اس "تربیتی" تقریر دلپذیر کے دوران میں ہی سیلانی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دوسروں کو دیکھنا بھالنا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ساتھ دماغ کو بھی کوسنا شروع۔ کہ کم بخت تجھے قرارداد تعزیت کے سوا کوئی اور بات بھی سوجھتی ہے؟ - اب تک نکتہ سنج حضرات آنے والے خطرے کو بھانپ گئے تھے۔ لیجیئے۔ محترم پرنسپل صاحب۔ اپنے رفقائے کار کی فوج ظفر موج کے ہمراہ تشریف لا رہے ہیں۔ اور ادھر امیدواروں کے حواس تشریف لے جا رہے ہیں۔ سال کی گھما گھمی کا مخصوص دن اچانک آ گیا۔ نہ ڈائس نہ لاوڈ سپیکر اور تقریر بھی فی البدیہہ!۔ غرض منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ زبان کے علاوہ جوڑ جوڑ متحرک تھا۔

سادگی یوں تو ہمارا شیوہ ہے۔ مگر ہماری سادگی بھی تھوڑا سا تکلف کر لیا کرتی تھی۔ مگر اب تو سادگی نے تمام تر سادگی سے تکلف برطرف کر دیا۔ سادگی دیکھئے کہ امیدوار بڑی رقت سے اپنا اپنا نام خود پیش کرتے ہیں کہاں تعارفی ارشادات ـــ اور کہاں یہ کہ تائید کے لئے ملتجیانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔!! یہ لمحات تو خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اُف کنوینگ کے لئے زیرِ تکمیل "سہ ہفتہ" پلان صرف ایک ہی ریلے میں بہ گئے۔ امیدواروں کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر سیلانی تو رونے ہی لگا تھا ۔

مقالات

میر دردؔ کی صوفیانہ شاعری کا ایک محبوب موضوع

لطف الرحمٰن

بے ثباتی

خواجہ میر دردؔ سے کون واقف نہ ہوگا۔ آپ اپنے وقت کے مشہور صوفی تھے۔ اور صوفیوں کے ایک نہایت معروف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والدِ بزرگوار خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی ایک بلند پایہ صوفی اور شاعر تھے۔ جن لوگوں کو دردؔ کے کلام کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ آپ کے کلام میں تصوف کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ آپ نے مختلف موضوعات کے متعلق اپنے خیالات و افکار کو سپردِ قلم فرمایا ہے جن پر تبصرہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں صرف ان کے ایک محبوب موضوع کو منتخب کیا گیا ہے اور اسی پر تبصرہ کیا جاتا ہے

میر دردؔ اس ویرانۂ آباد نما میں انسان کی آمد کی غرض و غایت ـــــ اس کی فانیت، اور اس جہاں کی بے ثباتی کا ذکر نہایت دردناک انداز میں کرتے ہیں۔ اس دنیا میں آنے والے مجبور اور بے بس ہیں۔ انسان کیلئے موت کا پیالہ نوش کرنا مقدر ہے۔ انسان دنیا میں آتے رہے۔ کچھ عرصہ رہے۔ اور پھر چل بسے۔ گردشِ زمانہ کی چکیاں اپنی روایتی برق رفتاری کے ساتھ چلتی رہیں۔ اور لمحات، دن اور رات کی گود میں سوتے رہے۔ دن رات ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں۔ اور مہینے سالوں میں ڈھلتے رہے قومیں ابھریں اور مٹ گئیں۔ بادشاہ آندھی کی طرح آئے اور پھر بگولے کی طرح کرۂ ہستی سے ناپید ہو گئے ـــ!

میر دردؔ نے اس جہانِ ناپائیدار کی بے ثباتی اور حیاتِ مستعار کی فانیت کی طرف ذہنِ انسان کو منعطف کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس دنیا میں مکمل سکون کسے میسر ہوا ہے۔ اور کیسے میسر ہوگا: یہ کوئی ایسا سوال نہیں ہے کہ جس کا کوئی جواب تاریخ کے اوراق پر بکھرے ہوئے ناقابلِ تردید حقائق نہ دے سکیں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو مکمل طور پر جسمانی ـــ روحانی اور ذہنی سکون سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا مدعی ہو۔ انسانی معاشرہ میں دنیاوی لحاظ سے یہی تصور کیا جاتا ہے۔ کہ بادشاہ۔ امراء۔ اور روساء ہی زیادہ پرسکون زندگی گزار سکتے ہیں۔ مگر تاریخ بڑے واضح الفاظ میں اس وہم کو جھٹلا رہی ہے ـ اور ببانگِ دُہل اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ انہیں ہرگز مکمل سکون میسّر نہ تھا۔ ان کے محلات میں بھی روح فرسا تفکرات کا گزر تھا۔ جن کے تصور سے ان کے ریشمی بستر کانٹوں کی سیج بن جایا کرتے تھے! اور ان کی راحت آفریں آرام حرام ہو جاتے تھے۔!

آخری وقت میں سب نے روتے ہوئے اپنی حسرتوں کو آہوں کے مرغولوں میں رخصت کیا! اس حقیقت کو میر دردؔ نے بھی بیان کیا ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق میخانۂ عالم کے جتنے بھی میخوار آئے۔ انہیں وقت نے ناقابلِ برداشت صدمات پہنچائے۔ جن سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اور ان کی حسرتوں اور امیدوں کے خون سے ہی ان کی کتابِ زندگی کے اوراق کو داغدار کیا ؎

زمانے کی نہ دیکھی جرعہ ریزی دردؔ کچھ تو نے
ملایا مثلِ مینا خاک میں خوں ہر شرابی کا!

دردؔ سوچتے ہیں کہ آخر اس دنیا میں ابنِ آدم کو سکونِ کامل کی دولت گرانمایہ کیوں میسر نہیں؟ اس کا جواب

وہ خود ہی دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حرص و آز کی آندھیاں اس عمارت کو متزلزل کرتی ہیں۔ ہوس کشی اس دولت کو لوٹنے والے رہزنوں میں سرفہرست ہے۔ اس حرص و آز نے انسان سے ایک بہترین صلاحیت چھین لی ـــــ استغنا کے چھن جانے کے بعد حریص انسان دوسروں کے حقوق سلب کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا میں خرمنِ سکون کو اسی برقِ بے زمام نے بھسم کر دیا!

حرص کرواتی ہے روباہ بازیاں سب دنیاں
اپنے اپنے بور سٹے پر جو گرا تھا شیر تھا !

ایک اور شعر میں اس حقیقت کو وا شگاف کرتے ہیں کہ حیاتِ مستعار میں انسان کے مقدر کا ڈھانچہ کچھ اس طرح تعمیر ہے کہ کوئی انقلاب ہوا اور وقت کی گردش اُسے حسرت و انبساط کے سکون زاروں میں لے گئی۔ تو فوراً حالات نے پلٹا کھایا اور انسان غم و حزن اور تفکرات کے روح فرسا ویرانوں میں آبلہ پائی پر مجبور ہو گیا ؎

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

اسی طرح ایک شعر میں حیاتِ دنیا کی بے ثباتی کا نہایت دردناک انداز سے نقشہ کھینچتے ہیں ـــــ فرماتے ہیں کہ مرتے وقت انسان کو اپنی تشنۂ تکمیل حسرتوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ مگر وہ بے بس ہوتا ہے ـــــ مجبور ہوتا ہے۔ اور انہیں چھوڑ کر روتا ہوا چل بستا ہے ؎

اے دردؔ جس کی آنکھ کھلی اس جہان میں
شبنم کی طرح جان کو اپنی وہ رو گیا !

ایک اور شعر میں انسان کی زندگیٔ مستعار کے اختصار کا ذکر کرتے ہیں۔ کتابِ زندگی کے اوراق کو وقت کچھ اس برق رفتاری کے ساتھ الٹتا ہے کہ تھوڑے سے عرصہ بعد اس کتاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے ؎۔

ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا
پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

اس بے ثباتِ دہر میں ہر روز اس قسم کے ہزاروں واقعات اور حادثات انسان کی چشمِ نظارہ کے سامنے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس مسلسل تغیر و تبدل کا آخر مقصد کیا ہے؟ خواجہ صاحب کے نزدیک ایسے واقعات عبرت انگیز اور نصیحت خیز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اس بوقلمونی اور نیرنگی کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں ؎

گلستانِ جہاں کی دید کیجو چشمِ عبرت سے
کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخلِ ماتم کا

انسان کی مستعار زندگی اتنی مختصر ہے کہ اس کی تمام خواہشات کبھی بھی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتیں۔ یا اگر انسانی زندگی مختصر نہیں تو انسان بہت حریص ہے۔ اور اس کی خواہشات کا لامتناہی سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوتا کہ فرشتۂ اجل آ کر اُسے ابدی نیند سُلا کر اس تسلسل کو توڑ ڈالتا ہے اور اس طرح اُسے طویل عمر بھی مختصر نظر آتی ہے۔ بہرحال اُس کی تسلی نہیں ہوتی۔ اس کی خواہشات کی عمارتیں ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہتی ہیں۔ اور مرتے وقت اُس کے دل میں حسرتوں کا سیلاب امنڈ آتا ہے۔ میر دردؔ اب ان حسرتوں کی تکمیل کیلئے "حیاتِ جاودانی" کو منتخب کرتے ہیں۔ وہاں وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سیلاب ابدا ایک ابدی سکون سے اُس وقت بدلے گا۔ جب انسان دشتِ دنیا سے دشتِ عدم میں منتقل ہو گا۔

دشتِ عدم میں جا کے نکالوں گا جی کا غم
کُنجِ جہاں میں کھول کے دل میں نہ رو سکا

میر دردؔ نے ایک لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قیامت تک اہلِ قبر سکون کی حالت میں پڑے رہیں گے۔ اسکی وجہ دنیا سے محبت کی شراب کا خمار ہے۔ اس دنیا میں انسان نے اگر حیاتِ عارضی کی مے گلفام پی ہے۔ اب اُس کا خمار اس دن ٹوٹے گا۔ جب صورِ اسرافیل سے پہاڑوں کے

سنگلاخ سینے شق ہوں گے ؎

بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ
سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

اس جہان میں انسان کا قیام عارضی ہے۔ درد اس عارضی قیام کی قدر و قیمت کا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس دنیا کو دوبارہ دیکھنا انسانی آنکھوں کی قسمت میں نہیں۔ اس میخانہ میں میخوار شراب زندگی کا جام صرف ایک دفعہ ہی پی سکے گا۔ لہٰذا اس کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیئے۔ میر درد اس "حیاتِ مستعار" کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ ؎

غافل جہاں کی دید کو مُفتِ نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں اس عالم کو خواب میں

اسی طرح ایک اور شعر میں اس مختصر قیامِ عارضی کی قدر و قیمت کے احساس کا یوں تذکرہ کرتے ہوئے ان چند گنتی کے سانسوں کو بے فائدہ ضائع کرنے سے منع فرماتے ہیں ؎

بے فائدہ انفاس ضائع نہ کرائے دردؔ
ہر دم' دمِ عیسیٰ ہے تجھے پاس نہیں!

میر دردؔ اس جہان کے خرابے کی بے ثباتی کا تذکرہ ایک اور جگہ اسطرح کرتے ہیں۔ دیکھئے کس طرح دردناک انداز سے نقشہ کھینچا ہے ؎

جلتا ہے اب خس و خاشاک میں پڑا
وہ گُل کہ ایک عمر بھر چمن کا چراغ تھا!
گزرو جو اس خرابے پہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا!

اس ویرانہ آبادِ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے روح فرسا اور ہوش ربا واقعات و تغیرات کو دیکھنے کے بعد اگر ان پر غور کیا جائے تو طائرِ فکر کا حلقۂ پرواز بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے مگر انسان اس امر کا دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اب اس نے تمام رازوں سے آگہی حاصل کر لی ہے۔ میر دردؔ بھی جب آہ و بکا کے شور کو مسرت و شادمانی کی شہنائیوں کے مترنم نغموں میں گم ہوتا دیکھتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں ؎

نہ سمجھا دردؔ ہم نے بھید یاں کے شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

اس جہانِ فانی میں انسان کی پیدائش کا مقصد صرف عیش و عشرت نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے انسان کو یہاں بھیجا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حقیقی سکون عیش و عشرت میں بھی بسا اوقات میسر نہیں آ سکتا۔ جب تک انسان کے آگے پیچھے دائیں بائیں سکون ہی سکون نہ ہو تو اس وقت مکمل سکون سے لطف اندوز ہونا ناممکن ہے۔ دردؔ فرماتے ہیں کہ بے شک انسان کے مقاصد میں عبادت' بھی شامل ہے مگر صرف "خشک زہد" ہی مقصدِ وحید نہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مخلوق اس مقصد کے لئے پیدا کر رکھی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں!

خواجہ صاحب کے کلام سے صرف چند اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے اُن کی سادگی۔ پاکیزگی اور حقیقت نگاری سے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری

عبداللہ یار

دُنیا بھی عجیب حیرت خانہ ہے کبھی سکندر کو پیدا کرکے اس کے دل میں سکندرِ اعظم بننے کی خواہشات موجزن کر دیتی ہے کبھی فرعون کو جنم دے کر اس کے دماغ میں دعویٰ خدائی کا تصوّر رکھ دیتی ہے۔ ضحاک کا ظلم، نوشیرواں کا عدل، حاتم کی سخاوت اور محمد شاہ کی عیش پرستی سب اسی حیرت خانہ کی تصویریں ہیں۔ ان حیرت افزاء تصاویر سے ہم عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان خاموش تصاویر کی پیشانی سے اچھے یا بُرے کارنامے صاف دکھائی دے رہے ہیں جو اپنی خاموش زبانوں سے انسانی زندگی کی تصویر پیش کر رہی ہیں -!-

مگر یہی نہیں اس کا دوسرا حصہ نہ صرف انسانی زندگی کی تصویر واضح کر رہا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آنے والی قوموں کے دوش بدوش انہیں ترقی کی طرف گامزن ہونے کی ترغیب بھی دے رہا ہے۔

سعدی شیرازی نے فارسی زبان کو بامِ عروج تک پہونچا دیا اور آج بھی اس کی تصویر قوم کے کم سن بچوں کو زبان پروری کی ترغیب دے رہی ہے۔ شیکسپیئر نے انگریزی ڈرامیں بے مثال درجہ پایا۔ اور اسی طرح مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے اردو زبان کے گیسوؤں کو اس شان و شوکت سے لہرایا کہ اردو زبان کے ہر لفظ اور ہر نقطہ سے غالبؔ کی نثر نگاری اور شاعری کی خوشبو آنے لگی۔

اردو زبان کی پیدائش سے لے کر غالبؔ کے زمانہ تک شعراء ایک ہی لکیر کے فقیر چلے آتے تھے اور اس کورانہ تقلید سے سب سے پہلے غالبؔ نے بغاوت کی اور اس "ادبی باغی" نے بزمِ سخن کے رنگ و روپ کو بدل ڈالا ــــ شاعری کے بے جان قالب میں جان ڈال دی۔

غالبؔ کی مسیحائی کو اردو زبان کبھی بھی فراموش نہیں کر سکے گی غالبؔ کے اشعار صرف عشق و محبت کی ایک داستان نہیں بلکہ اس کی شاعری سے زبان پروری کی روح اُبھرتی ہے۔ رجب علی بیگ سرورؔ نے اپنی عبارت میں بڑے بڑے عربی اور فارسی کے الفاظ لکھ کر اپنا دھاک بٹھانے کی کوشش کی اس زمانہ کے لوگ جب سرورؔ کی عبارت کو پڑھتے تو عش عش کر اٹھتے۔ مگر غالبؔ نے اپنی نظم و نثر میں یہ چیزیں بہت حد تک نہیں آنے دیں۔ اس کے باوجود غالبؔ کا مقام بہت بلند ہو گیا۔

بدقسمتی سے اردو زبان یومِ پیدائش سے ہی اچھے ماحول سے محروم رہی۔ اس کے بعد پھر خاندانِ مغلیہ کے زوال نہ صرف مغل شہزادوں کو شبستانوں سے اٹھا کر بیابانوں اور جیل خانوں میں لاکر بند کر دیا بلکہ اردو زبان پر بھی بُرا اثر ڈالا -!

زوال و انحطاط کے زمانہ میں اردو زبان کے ادیب اور شاعر مارے مارے پھرنے لگے۔ قسمت نے کسی کی اگر یاوری کی تو کسی نواب کے ہاں چند دن گزارے۔ مگر پھر وہی سیاہ بختی کے بادل نظر آنے لگے۔ چنانچہ قدرتی طور پر شعراء ملک کی بدنظمی سے متاثر ہوتے۔ غالبؔ زمانہ کے ناموافق حالات سے بہت کم متاثر ہوئے کیونکہ ملک کی مسموم ہوا ان کے تخیّلات تک نہ پہنچ سکی۔ گو غالبؔ بھی اس پُر آشوب زمانہ سے متاثر ہوتے۔ مگر انہیں اس اثر کی وجہ سے "خوشامدی" کہنا صریح ناانصافی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کے خیالات اس قدر بلند تھے کہ وہ تمام حالات سے بے اثر رہ کر صرف حقیقی شاعری کی پرورش کرتے رہے جس کا نقشہ اقبالؔ کے اس شعر سے سامنے آجاتا ہے ؎

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

غالب کے اشعار میں دوسری چیز جو نظر آتی ہے وہ اُن کی تنہا پسند طبیعت کا اثر ہے۔ مگر اس کا سمجھنا کافی مشکل ہے۔ اِن کی تنہا پسند طبیعت کا نقشہ اس شعر پر ہی منحصر نہیں ہے ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بلکہ ان کے اس شعر میں بھی ایک ایسی رمز ہے جس کا تعلق انسان کی طبیعت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ جو بسا اوقات ایسا کہنے پر انسان کو مجبور کرتا ہے۔ مگر ان سب چیزوں کے باوجود انھوں نے طائرِ تخیل کی بلند پروازی کو برقرار رکھا۔

ان کا مختصر سا دیوان ان کے رفعتِ تخیل کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ کوئی شعر لے لیا جائے اور اس وقت کے ماحول کا تصور کر کے اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی بلندی کا حقیقی احساس ہونے لگتا ہے۔ شعراء کا تخیل صرف عاشق کو بزمِ ناز سے نامراد اُٹھتے دیکھ سکتا تھا۔ مگر غالب نے کچھ اور بھی دیکھا ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

ظرافت میں غالب نے جو مقام حاصل کیا اس تک شاید ہی کوئی شاعر پہنچ سکے۔ ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اسی طرح ان کے کلام میں فلسفیانہ نفاست کا اندازہ لگانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

بیا ؎ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں!

حقیقت تو یہ ہے کہ غالب نے اردو شاعری کا ایک نیا باب کھولا۔ اور آنے والے شعراء کے لئے وہ راستہ صاف کیا۔ جس سے وہ گذرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور اردو شاعری کو وہ مقام بخشا جو رہتی دنیا تک پسند خاص و عام رہے گا۔

غالب کے اشعار اس زمانہ میں بھی مقبول تھے — آج بھی دیوانِ غالب ہر شخص کی زبان پر ہے — آنے والی قومیں بھی اس مایہ ناز ادیب اور شاعر کی شاعری پر فخر کر سکیں گی۔ اور وقت زبانِ حال سے اعلان کرتا رہے گا۔ ؎

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے!

تبرکاتِ غالب!

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز غیر سے چاہیئے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں!

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

آتا ہے مرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

سلیم اختر صدیقی

"شاعری"

(ذیل کا مضمون مختلف اصحابِ فکر کے شاعری کے متعلق نظریات کا عکس ہے کہ جسے بہت سی کتب کے مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے)

شاعری کے حق میں اور اس کے خلاف بہت کچھ کہا اور سنا گیا ہے۔ جہاں اس کی مذمت کی گئی ہے وہاں اس کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ اور یہ دونوں نظریات جو کہ بظاہر متضاد نظر آتے ہیں۔ اپنی اپنی الگ اہمیت رکھتے ہیں افلاطون جسے اپنے زمانہ کا عقل مند ترین خیال کیا جاتا ہے اس نے جو یونان کے لئے ایک جمہوری نظام پیش کیا تھا اس میں بھی شاعری کے ... کی ضرورت تسلیم کی ہے۔

مگر اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے کہ دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ پیدا ہوئے کہ جنہیں قدرت نے یہی عطیہ عنایت کیا۔ عقل خدا کی ایک گراں بہا نعمت ہے مگر بہت لوگ اسے مکروفریب میں استعمال کرتے ہیں قوت و شجاعت بھی ایک عطیہ ہے کہ جسے لوگ قتل و غارت میں صرف کرتے ہیں۔ مگر ان امور سے عقل اور شجاعت کی برائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اسی طرح شاعری بھی برے استعمال کی وجہ سے بری نہیں ٹھہرائی جا سکتی ہے

مگر اس بات کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ سادہ شاعری اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ایک عطیۂ فطرت ہے اور موزونیٔ طبع ہے۔

تاریخ میں ہمیں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ شعراء نے اپنے اشعار سے لوگوں کے دلوں پر فتح حاصل کی۔ لارڈ بائرن کے متعلق مشہور ہے کہ لوگ اس کے اشعار حفظ کیا کرتے ہیں۔ اور کوشش کرتے تھے کہ خود بھی ویسے نظر آنے لگیں۔

بعض سیاسی ادوار میں شاعری نے بہت اہم کام سرانجام دیئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جب ایتھنز کو شکست ہوئی تو اس کے وقت سولن نے دانستہ مجنونانہ حالت اختیار کر لی اور ایک اونچے مقام پر کھڑا ہو کے اشعار پڑھنے لگا۔

"کاش میں ایتھنز میں پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ عجم یا بربر یا کسی اور ملک میں پیدا ہوتا۔ جہاں کے لوگ میرے ہم وطنوں سے زیادہ جفاکش اور محنتی۔ یونان کے علم و حکمت سے بے خبر ہوتے وہ حالت میرے لئے اس سے بہتر تھی کہ لوگ مجھے دیکھ کے ایک دوسرے سے کہیں کہ یہ شخص اس ایتھنز کا رہنے والا جو سیلمس کی لڑائی سے بھاگ گیا۔۔۔۔" مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان لوگوں کو اتنی غیرت آئی کہ انھوں نے سولن کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا اور دشمنوں پر فتح پائی۔

ایران کے مشہور شاعر رودکی کا قصہ مشہور ہے کہ امیر نصر بن احمد نے جب خراسان فتح کیا اور ہرات کی فرحت بخش آب و ہوا اس کو پسند آئی تو اس نے وہیں قیام کر لیا۔ اور بخارا کو خیرباد کہہ دیا۔ مگر ابوالحسن رودکی کے ذیل کے اشعار سے متاثر ہو کر واپس چلا گیا ؎

(۱) اے بخارا شاد باش و شاد زی
شاہ سویت میہماں آید ہمے
(۲) شاہ ماہ است و بخارا آسماں
ماہ سوئے آسماں آید ہمے
(۳) شاہ سرو است و بخارا بوستاں
سرو سوئے بوستاں آید ہمے

جہاں شاعری فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ وہاں شاعری جسے بری شاعری بھی کہا جا سکتا ہے۔ نے سوسائٹی کو نقصان پہنچایا ہے جس شعر میں زیادہ مبالغہ اور غلو ہوتا ہے وہ زیادہ مقبول عام ہوتی ہے اور اس شاعر کو زیادہ داد ملتی ہے۔

جہاں تک عربی شاعری کا تعلق ہے۔ وہاں اس کا مفہوم

بالکل الگ ہے جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی موثر اور دلکش تقریر کرتا تھا۔ اُسی کو شاعر جانتے تھے۔

شاعری کے لئے ازحد جو ضروری امر ہے وہ تخیل ہے۔ جتنا اعلیٰ تخیل ہوگا۔ اتنی ہی بلند پایہ شاعری ہوگی۔ اور یہ وہ چیز ہے۔ جو کہ انسان ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے اور اکتساب سے حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ ملٹن نے شعر کی خوبی میں لکھا ہے کہ وہ "سادہ ہو۔ پرجوش ہو۔ اور اصلیت پر مبنی ہو۔"

جہاں تک سادگی کا تعلق ہے۔ اس کا معیار یہ ہے کہ خیال کتنا ہی بلند و دقیق کیوں نہ ہو مگر الفاظ روزمرہ کی بول چال کے ہوں۔ جس قدر شعر کی ترکیب معمولی بول چال سے بعید ہوگی۔ اسی قدر سادگی کے زیور سے بعید ہوگی۔

اور جہاں تک جوش کا تعلق ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مضمون ایسے بے ساختہ اور موثر پیرایہ میں بیان کیا جائے کہ جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادہ سے یہ شعر نہیں لکھا ہے۔ بلکہ مضمون نے خود شاعر کو لکھنے پر مجبور کیا ہے مثلاً خواجہ دل محمد کے ذیل کے اشعار قابل قدر ہیں جن میں جوش۔ اصلیت اور سادگی بھی ہے ؎

صحابِ پاکِ مصطفیٰؐ کو حق نے کیا جگر دیا
کہ ہر قوم بے دھڑک ہر اک نے مال و زر دیا
جو کچھ کسی سے ہو سکا وہ لا کے ڈھیر کر دیا
کسی نے ثلث لا دیا کسی نے نصف گھر دیا
اور عائشہؓ کے باپ نے دیا تو اس قدر دیا
خدا کے نام کے سوا جو کچھ تھا لا کے دھر دیا
کہا "تمام مال و زر برائے حق نثار ہے"

مگر شاعری پہ ایک ایسا دور بھی آیا کہ جس میں سوائے شمع۔ پروانہ۔ شراب و کباب۔ پیالہ و مینا۔ صراحی و خم نشہ و خمار۔ ساقی دور نغمہ۔ مطرب و چنگ۔ ارغوان مضراب۔ ساز و رقص۔ شور و حدا۔ یاد و تمنا۔ حسرت و حرماں۔ رنج و غم۔ الم و سوز۔ داغ و زخم۔ خلش تپش کے کچھ نہیں تھا۔ مگر اسی دور کی شاعری کو پسند کیا جاتا رہا ہے کیونکہ اس میں لغو اور غلو بہت تھا اور صرف گل و بلبل اور صیاد کے قصے تھے۔ ذیل کا میر کا شعر اس قسم کی شاعری کی ایک مثال ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

موجودہ دور میں شاعری میں غزل کو بہت اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ اس میں کوئی مسلسل مضمون بیان نہیں کیا جاتا ہے بلکہ جُدا جُدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کئے جاتے ہیں۔ غزل کے لئے یہ ضروری بات قرار دی گئی ہے۔ کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پہ رکھی جائے۔ الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیئے۔

یہ عام خیال کیا جاتا ہے کہ ایک غیر زبان کے شعر کا دوسری زبان میں شعر میں ترجمہ کرنا کوئی قابل قدر بات نہیں ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں ترجمہ اصل سے بہتر ہوتا ہے مثلاً نظیری کا شعر ہے ؎

بوئے یارِ من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

اور اس شعر کو سوداؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

فارسی کا ایک اور شعر ہے ؎

"درِ محفل خود رہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دِل افسردہ کند انجمنے را"

اور اسی قسم کے خیال کو خواجہ میر دردؔ نے یوں بیان کیا ہے ؎

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے
دوستو دردؔ کو محفل میں نہ تم یاد کرو

کریم اللہ خاں ناصر

"المنار"

سمندری پانیوں کی لا محدود اور انجانی وسعتیں انسانی ارتقاء کے ابتدائی ادوار ہی سے انسان کی جولانگاہ بنی ہوئی ہیں۔ مشکلوں میں بے سوچے سمجھے کود پڑنے، ان دیکھی منزلوں کی جستجو کرنے اور بھیدوں کو پالینے کی خواہش نے کبھی انسان کو نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ اس نے اول اول سمندروں کے سینے پر درختوں کے تنوں کے سہارے بہنا سیکھا۔ اور جب ناموافق قوتیں اس کے بالمقابل آئیں تو اس نے ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اپنی بہتر مدافعت کے اسباب فراہم کرلئے۔ اور یوں درختوں کے یہ تنے مختلف ادوار سے گذرنے کے بعد باقاعدہ جہازوں کی صورت اختیار کر گئے۔

لیکن انسان اب بھی محفوظ نہ تھا۔ پانیوں کے اندر ان گنت خفیہ دشمن قوتیں موجود تھیں۔ ان میں مقناطیسی اثر پوشیدہ چٹانیں۔ نباتات کے الجھا دینے والے سلسلے۔ بپھرے ہوئے دھارے اور خوفناک پانیوں کے عجیب وغریب چکر تھے۔ جن سے انسان غیر آگاہی کی بنا پر دھوکا کھا جاتا تھا ۔۔۔ پانیوں کی ایسی ہی خفیہ انسان دشمن طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے انسانی ذہن نے آخرکار "مینارہ نور" کی تخلیق کی ۔۔۔ مینارۂ نور جسے انگریزی میں "لائٹ ہاؤس" کہتے ہیں۔ انسان کی بحری سرگرمیوں میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسری تخلیقات کی طرح انسان نے اس کی ارتقائی منازل کو بھی بڑی سرعت سے طے کیا۔ اور آج یہ ابتدائی تصور سے اس قدر مختلف ہوچکا ہے کہ مقصد کے سوا کوئی چیز بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تصور دو ہزار برس قبل یونانیوں کے [illegible] ساحلی مقامات پر آگ روشن کرکے سمندروں میں انسان کی رہنمائی کی۔ تارکین دنیا اور خدا ترس لوگوں نے بھی ایسے مقامات پر اپنی گپھاؤں کے باہر روشنی کرکے اس تصور کو اپنایا وقت کے ساتھ ساتھ یہ تصور نکھرتا اور سنورتا چلا گیا اور سولہویں صدی عیسوی میں اس نے باقاعدہ مینارۂ نور کی منزل اختیار کرلی۔ مینارۂ نور کی تاریخ میں سب سے بڑی اہمیت "ایڈی سٹون" کے مینارۂ نور کو حاصل ہے۔ یہ مینارہ پہلی بار ۱۶۹۶ء میں برطانیہ کی تنگ بحری گزرگاہوں میں پلائی ماؤتھ سے کچھ میل جنوب میں چند خطرناک نوعیت کی چٹانوں پر تعمیر کیا گیا۔ اس کا سب سے پہلا معمار ایک انگریز انجینئر "ونسٹن لے" ہے۔ اس کی تعمیر پر چار سال صرف ہوگئے اور یہ سارے کا سارا لکڑی کا بنایا گیا۔ اس میں تزئین ونفاست سے اس حد تک کام لیا گیا تھا کہ بادی النظر میں یہ کوئی چینی عبادت گاہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ مینار زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۷۰۳ء میں اپنے معمار سمیت طوفانی لہروں کی آغوش میں سوگیا!

۱۷۰۶ء میں "رڈیارڈ" ایک برطانوی تاجر نے اس مقام پر دوبارہ ایک مینار تعمیر کیا۔ ۱۷۵۵ء میں یہ بھی آگ کی نذر ہوگیا۔ اس کی نئے سرے سے تعمیر کرنے والوں پر اب یہ امر بھی واضح ہوچکا تھا۔ کہ مینار کی تعمیر میں لکڑی اور روشنی کے لئے ایندھن کا استعمال زیادہ کارآمد اور محفوظ نہیں ہے چنانچہ اس کے تیسرے معمار نے ان باتوں کے پیش نظر اسے پتھروں کی مدد سے تعمیر کرایا۔ "جان اسمیٹن" خود بھی ایک انجینئر تھا۔ چنانچہ اس نے استعمال کے لئے ایسے

پتھر ترشوائے جو دوسرے پتھروں میں چاروں طرف سے پھنسائے جا سکتے تھے۔

یہ تعمیر نہایت پائیدار ثابت ہوئی اور پوری ایک صدی تک روشنی کا یہ مینار جہاز رانوں کی رہنمائی کرتا رہا۔ اس کے شکستہ ہو جانے پر چوتھی اور آخری بار "سر جیمز ڈوگلس" نے تعمیر نو کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۸۲ء میں اس کی تعمیر پایہ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اور اس پر تقریباً نو لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اس کی بنیادیں سابقہ مینار سے ایک سو تیس ۱۳۰ فٹ کے فاصلہ پر ایک دوسری چٹان پر رکھی گئیں۔ یہ مینار ایک سو بائیس ۱۲۲ فٹ بلند اور چوالیس ۴۴ فٹ بنیادی محیط کا ہے۔ تعمیر میں استعمال ہونے والا ہر پتھر ایک دوسرے میں اس طرح پیوستہ ہے کہ سیمنٹ اور مسالہ استعمال نہ کرنے کے باوجود عمارت کے گرنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو سکتا تھا۔

پانی کی زیادہ سے زیادہ بلندی کے مقام سے پچیس ۲۵ فٹ اوپر تک مینار ٹھوس بنیادوں پر چلا گیا ہے اس سے آگے آٹھ فٹ موٹی دیواریں بلندی کی طرف اٹھائی گئی ہیں۔ جن کی موٹائی رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے دو فٹ رہ جاتی ہے۔ اس مینار میں ایک دوسرے کے اوپر کل نو کمرے ہیں۔ جن میں اوپر کے سات کمرے ایک جیسے ہیں۔ ان میں ہر کمرے کی بلندی دس فٹ اور قطر چودہ فٹ ہے۔ اور نیچے کے دو کمرے نسبتاً چھوٹے ہیں۔ مینار کے بیچوں بیچ ایک لوہے کی سیڑھی لگائی گئی ہے۔ چوتھے اور چھٹے کمرے میں لیمپ ہیں۔ استعمال ہونے والا تیل ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ ان ذخیروں گاہوں میں لوہے کے اٹھارہ بھاری بیرل ہیں۔ جن میں چار ہزار تین سو گیلن تک تیل ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ پانی کی ذخیرہ گاہوں میں چار ہزار سات سو گیلن پانی کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ چوٹی پر "فلیشنگ لائٹ" کا انتظام ہے۔ روشنی مت.. اور بھاری عدسوں کی مدد سے مختلف زاویوں سے مختلف سمتوں میں پھیلی جاتی ہے۔ روشنی نو سو سے ایک ہزار نو سو کینڈل پاور تک پیدا کی جاتی ہے۔ جو مختلف عدسوں کی مدد سے بڑھا کر ایک لاکھ انسٹھ ہزار چھ سو کینڈل پاور تک کر لی جاتی ہے۔ یہ روشنی صاف موسم میں اٹھارہ میل تک جہاز رانوں کی رہنمائی کر سکتی ہے۔

یہی روشنی مختلف اشاروں کی مدد سے جہاز رانوں کو خاص خاص موقعوں پر ہدایات دینے کے کام بھی آتی ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے سبب روشنی کے جدید مینار یہ سارا کام انسان کی غیر موجودگی میں خود بخود سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ اور وہ وقت آ پہنچا ہے۔ جب روشنی کے میناروں پر کام کرنے والے انسانوں کی تنہائیوں کے قصے خواب کے واقعات بن جانے کو ہیں۔

سمندروں میں اس قسم کے روشن میناروں کی وجہ سے آج بحری سفر بہت زیادہ آسان اور محفوظ ہو گیا ہے۔ اور یہ کہنا صحیح ہوگا۔ کہ آج کا انسان اپنے عزم و ہمت اور تدبر سے بڑی حد تک اپنی دشمن اور ناموافق قدرتی طاقتوں پر غالب آ چکا ہے۔

---

(۱)

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

(۲)

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اقبال

(تبرکات)
جناب رسا بریلوی

"شعلۂ حسن پتنگوں کا طلبگار نہیں"

گرمیٔ شوق نہیں مصر کا بازار نہیں
شعلۂ حسن پتنگوں کا طلبگار نہیں
ڈوبتے ہیں بھی تو احساس سبکساری ہے
غم کے دریا کی کوئی موج لچکدار نہیں
غم دہر کے طوفاں سے لرزتا کیوں ہے
آدمی ہے کوئی گرتی ہوئی دیوار نہیں
ٹھوکریں، ذلتیں، محرومی و رسوائی خلق
زندگانی کا کوئی راستہ ہموار نہیں
کیوں تڑپتا ہے مسافر سرِ منزل آکر
آخری سانس چلی ہے کوئی تلوار نہیں
جس خدا کو کوئی پوجے وہ خدا ہے اسکا
کون ہے وہ جو عقیدے کا پرستار نہیں
ظلمتیں ذہن کے بوسیدہ چراغوں کی لپٹ
فکرِ انساں تو اندھیرے میں گرفتار نہیں

———×———

"تعارف"

مولانا سے ملاقات کا شرف گذشتہ تعطیلات میں ہی حاصل ہوا کھلتا ہوا گندمی رنگ - چہرے پر گردشِ وقت کی چیرہ دستیوں کے نقوش، بال سفید، چائے کے دلدادہ ہیں، رسا صاحب پان کے بڑے رسیا ہیں، سر پر جناح کیپ - جسے پیشانی تک کھسکائے پر رہتے ہیں - چال مستانہ، انداز قلندرانہ، ملاقات کا انداز دلکش ان کی ساٹھ ستر سالہ زندگی کے ادبی ارتقا پر کیسے روشنی ڈالی جا سکتی ہے جبکہ ان کو خود بھی اس کا علم نہیں، مجھے بتایا کہ "بارہ سال کی عمر میں شعر کہنے کا چسکا پڑا تھا - اس کے بعد کیا ہوا؟

" فطرت کی روشنی دل و دماغ کو ہر لمحہ منور کرتی گئی - کونین کی حدوں تک ذہن نے رسائی کی - مجاز اور حقیقت کے چہرے بے نقاب ہوئے اور ان اسرار و رموز کو غزلوں کے فقروں، جملوں اور دائروں میں سمیٹ کر رکھ دیا ____

مولانا صفی لکھنوی، مرزا ہادی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی ان کے ابتدائی رہنما تھے، بعد ازاں عطا محمد شاکر، اطہر امرتسری - ضیا کاشمیری - عبدالعزیز فطرت - ابوالاثر حفیظ جالندھری - ذوالفقار علی خاں بخاری اختر شیرانی، سید عدم - پروفیسر کرم حیدری - باقی صدیقی - انجم رضوانی - رضا جعفری وغیرہ احباب سے گہرے دوستانہ تعلقات قائم رہے - اب شعر کہنے کی عمر تو نہیں، مگر کیا کہہ سکتے ہیں - ع

جوانی جا چکی، لیکن غزل خوانی نہیں جاتی!

(ادارہ)

قطعات

[illegible] دم و راہ بڑھانے کی دیر ہے
[illegible] اپنا جو کھانے کی دیر ہے
اب ساغر و سبو کے تکلف [illegible]
ساقی فقط نگاہ اٹھانے کی دیر ہے

○

بارات شب میں یوں کھویا ہوا [illegible]
کہ جیسے لاکھوں راتیں ہو چکی ہیں
فرشتے تجھ سے ظلم [illegible] پوچھتے ہیں
خدا سے کتنی باتیں ہو چکی ہیں

○

رسا بریلوی

جناب جوہر ڈبائیوی

حقیقتیں ہوئیں کب داستاں نہیں معلوم!

مختصراً ان کا تعارف یہ ہے کہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ پرانے رنگ کے دلدادہ ہیں۔ جناب امیر مینائی کے کلام سے خاص لگاؤ ہے۔ اور اُن کی زبان کا رنگ، آپ کے کلام سے جھلکتا ہے۔ جناب داغ دہلوی کے جانشین جناب نوح ناروی کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مگر پھر بھی مصروف زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مزاج میں وہی عالم شباب کا دم خم ہے ——— (ادارہ)

فغاں بلب ہوں مآلِ فغاں نہیں معلوم
وہ مہرباں ہوں کہ نامہرباں نہیں معلوم
عرق عرق ہے مری چشمِ تر ندامت سے
کہاں ڈبوئیں گے اشکِ رواں نہیں معلوم
بھٹکتی پھرتی ہے کم بخت دیر و کعبہ میں
ابھی جبیں کو ترا آستاں نہیں معلوم
نیاز و ناز میں یہ امتیاز کب سے ہوا
حقیقتیں ہوئیں کب داستاں نہیں معلوم
معاف رکھ مجھے صیاد نغمہ سنجی سے
نیا اسیر ہوں طرزِ فغاں نہیں معلوم
مجھے تو خیر تڑپنے کی ایک عادت ہے
تڑپ رہی ہیں یہ کیوں بجلیاں نہیں معلوم
سکونِ موت سے مانا کہ ہو گیا حاصل
یہ عارضی ہے کہ ہے جاوداں نہیں معلوم
فلک پہ کس طرح پہنچا یہ مرا مشتِ غبار
کہاں سے آ گئی تاب و تواں نہیں معلوم
پتہ تو چلتا ہے اس کا کہ میرا داماں ہے
مگر یہ ہو گیا کب دھجیاں نہیں معلوم
قفس میں دل پہ گذرتی ہے کیا اسیروں کے
زباں سے کہتے ہیں کیا بے زباں نہیں معلوم
یہ سوزِ دل کے شرارے ہیں یا ستارے ہیں
یہ آسماں ہے کہ دودِ فغاں نہیں معلوم
ملا نہ ایک بھی دل دردِ عشق کے قابل
کہاں یہ ملتی ہے جنسِ گراں نہیں معلوم
بتا رہا ہے کسے شیخ تو رہِ جنت
اسے بتا جسے کوئے بتاں نہیں معلوم
چمکتے برق کو دیکھا تھا آشیاں کے قریب
بچا کہ جل گیا پھر آشیاں نہیں معلوم
زمانہ ہو گیا دل کو جلے ہوئے جوہر
کہاں سے اٹھتا ہے اب یہ دھواں نہیں معلوم!

دو شعر

دو کروٹیں ہیں حسن کے لیل و نہار کی
تصویر اک خزاں کی ہے اک ہے بہار کی

ہیں اہلِ دل کہاں مرے چہرے اتار لیں
تصویر ہوں میں غم کدۂ روزگار کی

غزل

خلیل رامپوری

اب سوچ کر اٹھاؤ قدم میرے دوستو!
ہوتے ہیں سر یہاں پہ قلم میرے دوستو!

چاہو تو آج نظمِ گلستاں نکھار دو
ہاتھوں میں ہیں ہمارے قلم میرے دوستو!

ذہنوں میں کیا نگارِ شبستاں کی گونج ہے؟
کیوں پڑ رہے ہیں سست قدم میرے دوستو!

لٹنے دو لٹ رہی ہے اگر بادۂ وقار
چلنے دو دَورِ ساغرِ جم میرے دوستو!

کس رُخ کی چل رہی ہے ہوا کچھ خبر نہیں
کس پر یہ ہو رہا ہے کرم میرے دوستو!

جب تک طبیعتیں نہ رعونت سے پاک ہوں
بیکار ہیں یہ قول و قسم میرے دوستو!

یہ مطلعِ شفق پہ اُبھرتی ہوئی لکیر
کچھ کہہ رہی ہے شامِ الم میرے دوستو!

ویسے بھی آج کم ہے ستاروں کی روشنی
مت چھیڑیو فسانۂ غم میرے دوستو!

ہم اور اِک جہاں کی بنا کیوں نہ ڈال دیں
کب تک رہیں رہینِ کرم میرے دوستو!

جب تک چراغِ طور کی لَو برقرار ہے
لیتا رہے گا عشق جنم میرے دوستو!

قطعہ

خلیل رامپوری

جانے کیا رنگ لائے سرمستی
آج ساغر بدست بیٹھے ہیں
مانگ لو کچھ نہ کچھ فقیروں سے
آج موقعہ ہے مست بیٹھے ہیں

غزل

سعید بٹ

مرنے کی تمنا باقی ہے جینے کا نظارہ دیکھ لیا
اب ڈوب بھی جاؤ کشتیِ غم ساحل کا کنارہ دیکھ لیا

دل جلتے جلتے راکھ ہوا اب راکھ بھی کیا بھڑکے گی
گھر پھونک دیا جس شعلے نے اُس کا بھی شرارا دیکھ لیا

گلزارِ جہاں میں بیت چلی روتی ہوئی دنیا اپنی تو
پھولوں کی وفا کو دیکھ لیا پھولوں کا سہارا دیکھ لیا

برباد میرے ارمانوں کی دنیا کو کیا ہے دنیا نے
اب اور خواہش کیسی ہے انجام ہمارا دیکھ لیا

اس بزمِ جہاں میں اے کاش بستے ہیں جہاں کے غمزدے
ہم دیوانے اب آؤ چلیں دل دے کے خدارا دیکھ لیا

میرے خیال وِچ

محمد اکرام خان

ماڑد طوفان جد ساغر وِچ اُوندے
روڑے جاندے کنارے نئیں رہندے
دُکھ جس ویلے آپا اُوندے نے گھیرا
پیارے اوس ویلے پیارے نئیں رہندے
جدوں ٹُرس جاندا اے دلاں دا محرم
اودے اودوں اُکے سہارے نئیں رہندے
چڑھ جدوں اُوندا اے نقصان والا سوچ
عرشاں تے اوس ویلے تارے نئیں رہندے
دل جدوں ہو جاندے دلاں دے سانجھی
اکھیاں دے ہوٹوں اشارے نئیں رہندے
کِناں کوئی بیجے رہاں وِچ کنڈے
آدمی دے ہونوں گزارے نئیں رہندے
کنول جدوں کھان لگے پانی وِچ غوطے
بیجے بیڑی والے وچارے نئیں رہندے
لُٹی گئی ہمت سیلاباں دی جِسے کسے
اوہ اُم تیکھے تخت ہزارے نئیں رہندے

آزاد نظم

خلیل الرحمٰن خلیل

"اے غزالِ چمن"

تیرے جلووں کے ہیں تذکرے انجمن انجمن
اے غزالِ چمن
میکدے کی دلہن
تیرے آنچل کی بہتی ہوئی یہ ہوائیں لپٹ
جیسے قوسِ قزح
جیسے جگنو کی تحلیل ہوتی ہوئی ظلمتوں میں چمک
جیسے بہتی ہوئی داشرے اجنبی کی نظر
ڈوبتے چاند پر !
کان دھرتی ہوئی تیرے قدموں کی آہٹ پہ تاروں کی ضو
راستے میکدوں کے دکھاتی ہوئی تیرے عارض کی لو
وقت پر طنز کرتی ہوئی تری رفتار کی دلکشی
تیری مخمور پلکوں سے چھنتی ہوئی دودھیا چاندنی
شبنمی شبنمی
ہر نفس روشنی
ہر نظر زندگی
جیسے اٹھتی ہوئی نور کی آندھیاں
جگمگاتے ہوئے شہر سے
تیرے جلووں کی کیا بات ہے
اے غزالِ چمن !!

کاشر کاشمیری

آتشِ دل

دھواں دھواں دھندلائی راہیں
ناگن ایسی کالی راہیں
دُور فلک اندھیر نگر ہے
چاند ستارے ڈوب رہے ہیں
کہر کا طوفان دُھند کے بادل
بل کھاتی سی رات ہے ناگن
موت کے دیپک گائے راگن
دھواں دھواں دھندلائی راہیں
دُور دیس ہے دُور نگر ہے
راہوں پہ ہیں خار بچھائے
ڈگر ڈگر پہ جال بچھائے
چاروں کھونٹ شکاری چھائے
چیر کے دل اندھیر نگر کا
بچتے بچتے قدم اٹھائے
وہ ہے اپنا دیس! نگر ہے!
یہ پردیس ہے مت گھبراؤ — یہ پردیس ہے مت گھبراؤ
بجھی بجھی سی آتشِ دل سے
ڈھونڈ نکالو اک چنگاری — ڈھونڈ نکالو اک چنگاری
گردوں پہ اُمید کے جلوے
اُفق کا مکھڑا لال ہوا ہے
دل کا شعلہ بھڑک اٹھا ہے
جلدی جلدی قدم اُٹھائے، جلدی جلدی قدم اٹھائے

تراجم
خلشی

مداوائے روح !

○

اے میری روح ہے اک دیس بہت دور، اک دیس
چاند تاروں کے جہاں سے بھی دور
اے میری روح تیرے دکھ کا مداوا ہے وہاں
ہر طرف حسن ہی حسن !!
ہر طرف امن ہی امن !!
زیست کتنی خوابیدہ ہے واں !
اور وہ ہستی —————— !
جسے انساں نے چاہا کہ مٹا ڈالے
ابن آدمؑ کی شفاعت کا وہ ضامن انساں"
سششں جہات زیر نگیں تھے جس کے
وہ فقط تیری ہی خاطر تھا زمیں پر اترا
تا تجھے صاف کرے پاک کرے۔
روحِ انساں ! تیری عظمت کی بقا کی خاطر
تادمِ واپسیں وہ لڑتا رہا !!!

○

ایک ہی جست فقط ایک ہی جست پاس اسکے تجھے پہنچا دے گی
اور پھر پھول ہی پھول
اپنے پہلو میں لئے، سکھ کے سنہری سائے
جو سدا کھلتے ہیں مرجھاتے نہیں۔
آتی ہے نہ آئے گی خزاں جن پہ کبھی
اس سکوں زار میں پہنچا سکتی ہے ——
ایک ہی جست فقط ایک ہی جست !
چھوڑ —— اس دنیا کو ——————
یہ دنیا ؟ وہ خرابہ ہے جہاں
تجھے کو سکوں مل ہی نہیں سکتا۔ !
[illegible]

بچ کے جاؤ، تو کہاں ؟ کس کی پناہیں ڈھونڈو —— ؟
ہاں فقط ایک ہی در وا ہے
خدا کا در !
جو تیرے غم کا مداوا ہی نہیں، مونس و غمخوار بھی ہے،
مرہم آزار بھی ہے !!
اے میری روح تیرے دکھ کا مداوا ہے یہیں !!
(ترجمہ)

طلاق

زرتشت منیر احمد

تم نے کہا، ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں
ہاں اگر کسی آئندہ جنم میں ہم خیابان کی تتلیاں بن جائیں
تو ہم میں موافقت پیدا ہو سکتی ہے۔ !

شکست

ہم نہ کہتے تھے کہ فتح بڑی شاندار ہوتی ہے
اور اس میں کوئی شک بھی نہیں
لیکن اب مجھے یوں معلوم ہوتا ہے
کہ جب کوئی چارہ کار نہ رہے۔
تو شکست بھی شاندار ہو جاتی ہے۔

رابرٹ وٹمین

○

میں نے کئی دفعہ محسوس کیا ہے کہ ہمیں بھی کتاب کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے۔ جو شہد کی مکھی پھول سے کرتی ہے۔ وہ پھول سے معطر و شیریں رس چوس لیتی ہے مگر پھر بھی اس کی نازک کلیوں کو مجروح نہیں کرتی۔

کولٹن

محمود الشیبانی

پسِ پردہ!

○

مجھے عالمِ یاس میں چھوڑ کر
وہاں جا بسے ہیں میرے ہم نشیں
جہاں نور کا چاند جلوہ فگن ——
جس کی ضو میں کئی آشنا صورتیں
یاد آنے لگیں اور لمحات بھی ہیں
پردۂ ذہن پر تھرتھراتے ہوئے اُن کی یادوں کے عکس
ہونے لگتے ہیں پھر کچھ نمایاں ذرے

○

پھوٹتی ہے کرن یاد کے دیپ سے۔
اور سینے کے تاریک غاروں میں پھر
وہ نظر آنے لگتے ہیں بجھتے دیئے کی طرح
جیسے میرے فسردہ خیالات ہوں
جیسے ڈوبے ہوئے فکرِ انجام میں۔
چند مغموم تارے دمکتے ہوئے۔
یا خزاں کے بگولوں کے پہرے میں جب
درختوں کے جھنڈ جیسے ماتم کناں ہوں!!

○

یا لرزتی ہوئی زرد کرنوں کی مانند
جو بے تاب ہو کر لپٹتی ہیں غم میں
کسی اجنبی سائے سے۔
دُور کالی چٹانوں پہ جا کر
اُن غم آگیں لمحات میں جب تھکے ہارے سورج کو ظالم اندھیرا
—— نگلنے کو منہ کھولتا ہے!!

○

تمکنت کی فضائیں بھی ہیں مرتعش
ان خیالات کے کچھ حسیں رقص سے
روشنی کی کرن پھوٹتی ہے کہ جیسے تھرکتے ہوئے آنچلوں کی لیک
یوں نظر آنے لگتے پھر دفعتاً
وہ لمحات بیتے ہوئے ——
جیسے لپٹے ہوئے خامشی کے کفن میں
کوئی سُورما سو رہا ہو بڑے ناز سے
وقت کی گود میں -!

○

اے مقدس تمنا! یہ تیرے مقدر کے مندر کا اونچا کلس
کتنا اونچا ہے یہ -، جتنا نیلا گگن!
یہ لمحات کیا ہیں؟ یہ کچھ بھی نہیں!!
ہاں فقط تیرے قدموں کے دُھندلے نقوش
جنہیں دیکھ کر وقت جلتا رہے!
اور ہستی کے سینے سے شعلہ لپکتا رہے!
تا کبھی مشتعل ہو کے غیرت سے اُٹھے بھڑک
محبت کی کُشتہ شمع!!

موت کی یہ دلہن ——!
کیا یہی وہ نگینہ ہے، ہوتا نہیں کم کبھی جس کا نُور؟
ہاں جس کی شعاعوں سے ہوتا ہے ظلمت کا سینہ بھی شق
کتنی پیاری ہے دِل سے مجھے!!
کتنا حیرت فزا ہے یہ گنجینۂ مرگ بھی
اور پسِ پردۂ خاک، "خاکی" کو دیکھ
کر رہتا ہے کیسے سکوں زار میں!

○

ناز کرتے ہو اپنی بصارت پہ تم
پر تمہاری نظر میں تو کچھ بھی نہیں
ہاں فقط ایک اُجڑا نشیمن کہ جس سے
اُڑ گیا طائرِ خوش بیاں۔
اِذنِ پرواز پر،

اور ویرانیاں دیکھ کر یہ نظر
ڈوب جاتی ہے اک اشکِ بے موج میں!
کیا اسی پہ ہو نازاں اے اہلِ نظر
کرو چشم وا اے میرے ہمسفیرو!
دیکھو ذرا وہ بہارِ آفریں گلستاں
ہے جہاں طائرِ خوش بیاں نغمہ ریز
جس کے نغماتِ شیریں سے صحنِ چمن میں بھی دھوم ہے!

○

جب روحِ انساں اٹھا دیتی ہے عنصری قفس سے
سیہ چلمنیں قید کی
اور پرواز کرنے کو پر تول لیتی ہے۔
تو اس عشوۂ جاں فزا سے فرشتوں پہ چھا جاتی ہے
ایک میٹھی سی نیند ———— !
وہ بلاتے ہیں بے ساختہ
اپنی خوابوں کے محلوں میں اُس رُوح کو
اور رُوح پھر غلامی کے چنگل سے پا کر رہائی
جاتی ہے جیسے مہکتی ہوئی چاندنی
کسی منتظر نازنیں کے شبستاں میں،
اس طرح چند اچھوتے خیالات بھی
لینے لگتے ہیں انگڑائیاں ذہن کی رفعتوں میں
اور حرکت میں آ جاتے ہیں اُن کے رنگیں لبوں کے خطوط
چُوم لیتے ہیں جو بڑھ کر مچلتے ہوئے ساز بردوش
تاروں کے گال!!

(انگریزی سے ترجمہ)

اشعار

اشعار
محمد ہادی مومن

محبت نام ہے بیتاب اشکوں کی روانی کا
محبت میں تمنائے سکونِ دل سے کیا حاصل
کسی کی یاد میں رونا تڑپنا میرا شیوہ ہے
دلِ ناداں! تیری سعیٔ لاحاصل سے کیا حاصل
یہ گہری آرزوؤں میں دبی آواز کہتی ہے
جہانِ عارضی میں فکرِ مستقبل سے کیا حاصل
ارے مومن تجھے اہلِ زمیں سے واسطہ ہی کیا
تجھے آخر کسی کی رونقِ محفل سے کیا حاصل

قاصد ظریف

آپ آئے ہیں جب بھی میرے پاس
دل کے شعلے لبوں پہ آئے ہیں
تیرے ہاتھوں اے گردشِ دوراں
کیسے کیسے فریب کھائے ہیں
اُن کی محفل سے آج اے یارو
دلِ شکستہ ہی لوٹ آئے ہیں
جب بھی آئیں، فراق کی گھڑیاں
آنسوؤں کے دیئے جلائے ہیں
دوسروں کا تو کچھ نہیں شکوہ
آپ کیوں ہم پہ مسکرائے ہیں!

غزل

وہ آئے بزم بسمل بنا کر چلے گئے
آنکھوں کی پیاس اور بڑھا کر چلے گئے
ارمان ہائے دل کو مٹا کر چلے گئے
الفت ہزار دل میں جگا کر چلے گئے
اتنا سا کام دل کے دل ہی میں رہ گیا
وہ مسکرا کے ہاتھ چھڑا کر چلے گئے
ارماں سبھی رہ گئے ان کی محفل میں
سب اپنی اپنی پیاس بجھا کر چلے گئے
منظور تشنہ کام

افسانوی ادب

اشکِ یتیم

اے ۔ کے ۔ بازغی

دلاور کے نحیف و لاغر جسم پہ چچی کے اُبھرے ہوئے نیلے نیلے نشان ماتمِ فریاد تھے ۔۔۔ اُس کی گھٹی گھٹی سسکیاں استبدادی ماحول میں دم توڑ رہی تھیں ۔۔۔ سردی کے بھرے ہوئے طوفان میں اُس کے ٹھٹھرے ہوئے ہونٹوں پہ ہچکیوں کا تار بندھ گیا ۔ رات کے خاموش سناٹوں میں یخ آلود شبنم اُس کے بکھرے ہوئے بالوں پہ گرتی رہی ۔۔۔۔۔

چھوڑ گیا ہے اُس کا باپ لاکھوں کی املاک ۔۔۔ جو ہم پہ رُعب ٹھونس جاتا ہے ۔۔۔ گیا کدھر ہے ؟ ۔۔۔ ذرا دیکھوں تو رئیس زادے کو ۔۔۔ مہر نے شمع کی ہلکی ہلکی کرنوں میں اِدھر اُدھر ٹٹولتے ہوئے کہا

ایسوں کو موت بھی تو نہیں آتی ۔۔۔۔۔
ہٹا کٹا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے مفت کی روٹیاں اڑا رہا ہے ۔۔۔ ایسے ہی ہوتے ہیں نمک حرام

بیوی نے مہر کے غیظ و غضب کو اور بھڑکانا چاہا ۔۔۔ اور وہ برداشت بھی کس طرح کر سکتی تھی ۔۔۔۔

دلاور تو تھا مہر کا بھتیجا ۔ مگر بچپن میں ہی ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔۔۔ اور ان کی محنت و مشقت کی نشانی جو ایک مکان اور سات آٹھ سو نقدی ۔ مہر کی منقارِ ہوس پہ بھینٹ چڑھ گیا ۔۔۔ اب دلاور کی روکھی سوکھی بھی اُن کے لئے باعث تکلیف تھی ۔۔۔ کیونکہ مہر کی بیوی کو ۔۔۔ جس کی نگاہیں گدھ سے بھی زیادہ تیز تھیں ۔۔۔ یہیں اندیشہ لاحق رہتا کہ کہیں بڑا ہو کر اپنے حق کا طلبگار نہ ہو ۔ آج کی زدوکوبی بھی چچی کی بناوٹی شکایت پر ہوئی ۔۔۔ مہر جو پہلے ہی شدگا شدگا تھا ۔۔۔ جھوٹ کو سچ سمجھ کر بھڑک اٹھا اور خوب دلاور کی پٹائی کی

دلاور اسی ٹھٹھرے ہوئے ماحول سے گھر سے بھاگ نکلا اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ چچا اور چچی کی بے جا سختیوں کو اب برداشت نہیں کرے گا ۔۔۔ وہ بھیک مانگ لے گا ۔۔۔ مزدوری کرے گا ۔۔۔ آخر اس کا دوست ملنا بھی تو ہے ۔۔۔ بس اسٹینڈ سے مسافروں کا سامان اُٹھا کر روزانہ نو دس آنے کما لیتا ہے ۔۔۔

وہ تصورات کے بہتے ہوئے دھارے میں اڈے پہ پہنچ گیا ۔۔۔ اس وقت چاند کی ہلکی ہلکی کرنیں بھی سردی سے ٹھٹھر رہی تھیں ۔۔۔ رات زوال پذیر تھی ۔۔۔ کانپتے ہوئے ستارے صبح کے دھندلکوں میں روپوش ہونے کے لئے بیقرار تھے ۔۔۔ ویٹنگ روم کے گرم گرم ماحول میں اُس نے اطمینان کا سانس لیا ۔۔۔ اور پھر ایک ٹوٹے ہوئے بنچ پہ وہ آرام سے سو گیا ۔۔۔

قریباً نو بجے ایک کرخت آواز اس کے پردہ گوش سے ٹکرائی ۔۔۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا ۔۔۔

"اُٹھ یہاں سے بھاگ ۔۔۔ کیسے مزے سے سو رہا ہے ۔۔۔ جیسے اس کے باپ کی ملکیت ہے"

۔۔۔ یہ مقامی بس سروس کا منیجر تھا ۔۔۔

باپ کی ملکیت ۔۔۔ میرا باپ تو مر چکا ہے ۔۔۔ اُس کی ملکیت تو ہے ہی نہیں ۔۔۔ پھر میرے لئے کوئی جگہ نہیں اتنے بڑے سنسار میں ۔۔۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کا دل مسوس کر رہ گیا ۔۔۔ اور منیجر کی لمبی لمبی مونچھوں سے خوف زدہ دلاور ویٹنگ روم سے باہر آ گیا ۔۔۔ اس وقت بھوک کی شدت اُس کے اُبھرے ہوئے زخموں

سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی ...... اُس کے چہرے پہ بے کسی و یتیمی کا درد انگیز ماحول محیط تھا ...... کوئی چیز تو چُرا کر نہیں لے گیا وہ .... ؟ ..... ایک خاتون جس نے چھوٹی نمائش کا غازہ لیپ کر چہرے کی بدنمائی کو ڈھانپ رکھا تھا ...... اپنے خاوند سے گویا ہوئی ..... جو بیٹری کے ٹکڑے کو ٹٹولنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ..... جان سے مار دوں گا میں اسے اگر ...... دیکھو تو گنتی ٹھیک ہے ؟ ..... جُراب نہیں ملتی بنّوں کی ...... ذرا جلدی اُٹھو .... بھاگ جائے گا ...... اور زن مرید شوہر نے باہر آتے ہی ٹھٹھرے ہوئے مجروح دلاور کے ایک زور کا چانٹا رسید کیا ..... بتا دے جُراب ...... ورنہ خون کر دوں گا اسی جگہ ..... "یہ تو مل گئی ہے ..... بنّوں کے ابّا" ...... اندر سے بیگم صاحبہ نے اطلاع نشر کی ...... بھلا خاوند کی مجال جو حکم سے روگردانی کرتا ..... اُسے وہیں چھوڑ کر بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا!!

دلاور اِس استبدادی ماحول سے بھاگ نکلا ... دور ہریالی کھیتوں کو روندتا ہوا کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا گیا ...... آزاد فضاؤں نے اُس کے مجروح ذہن کو طراوت بخشی ۔ وہ ہواؤں کے ہلکے ہلکے تھپیڑوں میں آوارہ تنکوں کی طرح بڑھتا رہا ...... پتوں کی سرسراہٹ میں اس کے قدموں کی چاپ گونج کے نغمے بکھیرتی ہوئی فضا کی بیکراں وسعتوں میں تحلیل ہو جاتی ...... اچانک امید کی ہلکی سی کرن اُس کی اندھیاری تمناؤں میں پھیل گئی ... اُسے موسیقی کی گونج کے ساتھ ڈھول کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز سنائی دی۔

کسی گاؤں میں براتیوں کے خوشی و طرب میں ملے جُلے قہقہے سنائی دیئے .... اُس کی لاغر ٹانگوں میں زندگی کی رمق دوڑ گئی ... اب وہ اُس گاؤں میں تھا .... جہاں سب کچھ تھا ..... دیگوں کی کھنکھناہٹ ...... زردہ پلاؤ کی بھینی بھینی خوشبو۔ مُرغ کے بُھنے ہوئے گوشت میں مسالوں کی مہک .... اور وہ دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا ... مبادا چوری کے الزام میں پٹائی نہ ہو جائے .... وقت اُس کی بھوک میں اضافہ کرتا ہوا گزرتا گیا .... اور وہ دور کھڑا رہا ....

کیا بات ہے ؟ .... یہاں کیوں کھڑے ہو ؟ ... ایک آواز گونج پیدا کرتی ہوئی اُس کے گوش سماعت سے ٹکرائی .... روٹی ..... گھبرا کر دلاور نے جواب دیا ..... یہ دُلہن کا باپ تھا .... اور گاؤں کا چوہدری ..... اُس نے چند آوارہ لونڈوں کو بلایا ..... جو دلاور پہ اس طرح جھپٹے .... جس طرح بلی چوہے پر .... یا بھوکا کھانے پہ ...... دلاور کو گھسیٹتے ہوئے دور کھیتوں میں لے گئے .... یہ انسانوں کی شکاری نسل کے بچے اپنے شکار سے کھیلتے رہے۔ پھر اُفق مغرب پہ سورج نے اپنی سنہری کرنیں سمیٹ لیں سارا ماحول ٹھٹھر گیا ..... تمام کھیل چھوڑ چھاڑ اپنے اپنے گھروں کو بھاگے .... جہاں اُن کی مائیں محو انتظار تھیں۔ اپنے جگر گوشوں کے لئے۔ گرم گرم کمروں میں چائے کے گرم گرم دَور چلنے لگے ..... پھر انسان رضائیوں میں دبک گئے .... اور آسمان پہ چھائے ہوئے بادلوں نے برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دھرتی کے نازک سینے پہ برسانے شروع کر دیئے ....

علی الصبح گِدھوں کا ایک غول اُن ہریالی کھیتوں پہ منڈلا رہا تھا۔ انسانی شکار کا بے جان ڈھانچہ اب گِدھوں کی زد میں آ گیا ..... (باقی بر صفحہ ۳۲)

کلیم کوہستانی

"بیچارگی!"

ایک حقیقت، ایک افسانہ

حقے کی کش کھینچتے ہوئے خاک دہلوی نے کہا —
"بی بی! ذرا ہمیں الہ آبادی پان اور شامی کباب تو منگوا دو"
ٹھیک ہے! پان اور کبابوں کے نشے میں ٹوٹے ہو
— اور یہ خبر نہیں کہ آج کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں —
بھاڑ میں جاؤ تم — اور جہنم میں جائے شاعری —
پیٹ کی فکر نہیں اور لگے ادب پر روشنی ڈالنے —!
خاک ڈالو گے روشنی ادب پر — !۔ " چپ بھی
ہوتی ہو یا نہیں — یا محلے میں چار کو سنا کر ہی دم
لوگی — یا پھر گدی کھنچوانے کو جی چاہ رہا ہو گا، جو
ایسے کر رہی ہے — رہا سہا خاک ہی تو ہے
جو ادب پر روشنی ڈالنے رہ گیا ہے — باقی تو خاک
ہو کر خاک میں جا ملے — بتا کوئی ہے —
تیری زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے — مگر کام کرتے
وقت مرگی پڑتی ہے" —

"دیکھو جی! میں نے تمہاری کیا خدمت نہیں کی،
جوتیوں کیسے جا رہے ہو — تمہارا کونسا کام اب
تک نہ کیا — جو کچھ کہتے رہے ہو، وہی تو کرتی
رہی ہوں" —

"میں کہتا ہوں — اگر اب تک کرتی رہی ہو، تو
اب کیا روگ اٹھا تھا جو زبان اتنی دراز کر لی،
اور میرے خیالوں کی لٹوں کو اپنی قینچی سی زبان
سے کاٹ کر جھونک دیا بھاڑ میں —
دیکھ لیا تمہیں اور تمہاری خدمت کو —
یاد رکھو ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اتنی ہی خدمت کا خیال
ہوتا تو یوں نہ کہا ہوتا — بلکہ کسی دکان سے
ہمارے نام ادھار [illegible]
کہاں، اتنا خیال"؟

دیکھو میاں! — ادھار کس منہ سے منگواتی —
تمہاری یہاں کونسی آمدنی ہے جو سونے میں تلتی
ہے — اور جائیداد بھی — چار سال سے
تمہارا منہ دیکھتے دیکھتے یہ دن آگئے ہیں —
کام کا سن کر تو تمہارے جسم میں کپکپی طاری ہو
جاتی ہے — پان اور کباب نہ ہو تو
تمہارے قلم کی نوک بھاری ہو جاتی ہے —
زیورات کو تمہاری بے روزگاری نے نگل لیا۔
اور گھر کا دوسرا سامان تمہاری لاابالیوں میں
تحلیل ہو کر ختم ہو چکا ہے — اب اور کیا
کرنا چاہتے ہو — ؟"

یہ سب سن کر خاک دہلوی سر کھجاتے
اور ٹوپی سے خاک جھاڑتے ہی رہے — نہ
جانے پھر کس چیز کا نشہ چڑھا کہ فوراً لب جوئی
کی — کہنے لگے — "سنو بی بی! اچھا میں نے
فیصلہ کر لیا ہے کہ آج یا تو ملازمت حاصل کر کے
لوٹوں گا — وگرنہ تمہیں میرے انتظار کی
ناجائز زحمت نہ اٹھانا پڑے گی —"

بی بی بولی — " یہ آج نہیں سن رہی —
یہی سنتی آئی ہوں ایک عرصے سے — نہ جانے
ایک ایک کر کے کتنے دن گذر گئے —
اُدں ہُوں — میری جوانی کو تمہارا غم دیمک کی
طرح چاٹ گیا — بالوں کی سیاہی جاتی رہی۔
(حالانکہ نذیراں خاک دہلوی سے دس سال
[illegible]

کہہ دیا ـــــ مگر تم ہو کہ پتھر پر بارش کا اثر نہ ہونے کی زندہ مثال" اب خاک دہلوی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے ـ باکو ٹال والے ـ کبیرا اخبار والے ـ چھاپان والے ، نے اس سے شعر سُن کر داد نہ دی ہو ـــــ

وہ سوچ کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبا ہوا کوئی بندش جوڑ رہا تھا ـــــ خدا جھوٹ نہ بلوائے ـــــ میں نے اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو اس کا احساس تک نہ ہونے دیا ـــــ اور نہ ہی وہ تمہاری کرتوتوں سے واقف ہیں ـــــ اگر انہیں پتہ چل گیا تو شاعری واعری کیا ـــــ اس کا نشان بھی چراغ لے کر دیکھنے سے نظر نہ آئے گا ـــــ وہ تو یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ چچا جان مرحوم کا چھوڑا ہوا اثاثہ کام آ رہا ہے"

یہ سُنتے ہی خاک بھڑک اٹھے اور نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی ـــــ بی بی نے خاک کو دھکا دے کر یوں گرا دیا ـ کہ بس مٹھی میں خاک پکڑ کر رہ گئے ـــــ اور گرے بھی کیسے ـ جیسے موسم بہار کی آمد پر ہوا کے معمولی سے جھونکے سے درخت کا عمر رسیدہ پتا جھڑ کر خاک پر آ پڑے ـــــ بیچ بچاؤ ہو گیا ـــــ وونہہ ـــــ اب کیا تھا ـ جھلتے ہی کمر سیدھی کی غصے نے ان کے دل میں پنجے گاڑ دیئے ـــــ مگر کیا کر سکتے تھے ـــــ اپنی سی بہت کی ـــــ یعنی کپڑے جھاڑے ـــــ آستینیں چڑھا ـــــ ہاتھوں اور لبوں کو جنبش دے کر دانت پیس کر بیٹھ رہے ـــــ ابھی مزاج موسم گرما کے پارے ہی کی طرح تھا کہ تھوک اڑاتے ہوئے گویا ہوئے ـــــ

"مجھے ایسے لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے ـــــ جنھوں نے عورت کو پھول سے تشبیہ دے کر تشبیہ [illegible] جو ہیں وہ جاپانی نازک کھلونے ہیں یہ ! زیادہ چھیڑ چھاڑ سے ٹوٹنے کا امکان ہے ـــــ اچھے کھلونے ہیں یہ ! جو ہمیں بھی اس طرح اڑا دیتے ہیں جیسے آئینہ پر سے گرد و غبار ـــــ اور جس طرح ہوتق نے کہہ دیا ـ کہ یہ ستاروں کی حسین چھاؤں ہے ـ اس نے تو اپنی حماقت کا مکمل ثبوت دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ـــــ اور سُنئے ! کوئی کہتا ہے کہ اُن کے چار عدد پرشتے ہیں ـــــ وہ چلّا اٹھا ـــــ میں کہتا ہوں کہ آخر مظلوم بھی کوئی شئے ہے یا نہیں ؟ کیا یہ اسی گناہِ عظیم کے باعث موجب ملامت ہے کہ اس نے حوا کو جنم دیا ـــــ پھر اس کے ایک ادنیٰ اشارے پر جنت جیسی حسین جگہ کو خیر باد کہا ـــــ اب اس بچارے کی انفرادی حیثیت بھی ختم ہو کر رہ گئی ـــــ وہ اب نیم پاگل ہو گیا ـ بال بکھر گئے ـــــ حرکات تیز تر ہو گئیں ـــــ مُنہ سے تھوک کی بجائے پان کی پیک اڑنے لگی ـــــ اور گلے کی گہرائیوں سے آواز نکالتے ہوئے کہا ـــــ میرے خیال میں عورت صرف عورت ہے ـــــ اس کے علاوہ کچھ نہیں ـــــ اس سے زیادہ کچھ نہیں ـ اگر ہے تو وہ ہے ـــــ "بلاٹنگ پیپر" ـــــ

بس کچھ نہ پوچھئے ـــــ داستاں کل کل بڑھتا ہی گیا ـــــ جب لوگوں نے یہ دھاچوکڑی سنی تو فوراً صدر دالان میں آ دھمکے ـــــ مشاہدہ پر معلوم ہوا کہ خاک دہلوی بجائے ادب پر روشنی ڈالنے کے ہوتی روشنی سلب ہونے کی گراں قدر وجوہ پر روشنی ڈال رہے تھے ـــــ

[illegible]

جس طرح شہر خموشاں میں ——

مگر اس بڑھی لیلی بی بی نے پھر باتوں کا لاوا اچھالنا شروع کر دیا —— میں کہتی ہوں کہ کچھ کرے گا بھی یا نہیں؟ یا صرف اسی طرح کسی اور پر روشنی ڈالتے گا ——؟

خاک دہلوی کا پارا بلندی سے پستی کی طرف گرنے لگا —— سر ہلاتے ہوئے اور ہونٹوں کو بل دیتے ہوئے کہنے لگے —— میں کچھ سوچ رہا ہوں —— اور کچھ تلاش —— تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو تو پتہ چل جائے گا۔" —— جی دیکھ لیا —— مگر بوسیدہ سی اور میلی بنیان کے سوا کچھ نہ نظر آیا —— نہ جانے تم کونسی شئے کے متلاشی ہو ——؟ جو تمہارے ضمیر میں دم توڑ چکی ہے"

سوچنا وچنا کیا ہے —— اور تلاش ولاش کا ہے کی —— بس یہی تو سوچ رہا ہوں کہ اگر تیرا نام نذیرن بی بی کی بجائے بشیرن بی بی ہوتا تو مجھے ڈرانے والی کی بجائے بشارتوں کے ہاتف سے واسطہ پڑتا" ——

میں کہہ رہی ہوں یہ اختراعیں چھوڑ دو —— ورنہ ....."

یہ اختراع نہیں —— میرے دل کی آواز ہے —— گھبراہٹ کے بندھنوں کو توڑ دو —— صبح کا سورج مجھے نہ دیکھ سکے گا —— میں دور —— بہت دور —— اتنی دور چلا جاؤں گا، جہاں غم اور تفکرات کے سائے بھی نہیں پہنچ سکتے" ——

"خدا کرے ایسا ہی ہو" ——

زندگی کے دوراہے پر جاتے ہوئے، ایک جیون ساتھی —— ایک سہارے —— سے

یہ سن کر خاک دہلوی کی آنکھیں غبار آلود آئینے کی طرح بے رونق ہو گئیں —— بعد ازاں یوں ڈبڈبا گئیں —— جیسے باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے بچے کی آنکھوں میں گیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے آنسو کے ساغر چھلک اٹھیں اور سانس گھٹتا ہوا معلوم ہو ——

شام کے سائے دھندلے ہو چلے تھے —— سورج اپنا روشن لبادہ سمیٹ کر ایوانِ مغرب میں روپوش ہو رہا تھا —— کرنیں مکانات کے بلند کنگروں پر اپنے الوداعی بوسے کا زرد نشان چھوڑ کر ڈوب رہی تھیں —— آسماں کی وسعتوں میں ملکۂ شام نے اپنا سنہری دوپٹہ پھیلا دیا تھا ——

وہ تلملا کر اٹھا اور چل پڑا —— سیدھا چھجے پان والے کو جا نجرا کیا —— اس نے تمام ماجرا دریافت کیا —— چھجے! میری ضمیر یہ گوارا نہ کرتی تھی کہ تمہارے پاس آ کر کچھ مدد مانگوں —— مگر جب میری غیرت نے یہ برداشت کر لیا تو میرے قدم تمہاری طرف بڑھے —— میں تم سے کچھ روپے لینے آیا ہوں تاکہ اس شہر سے دور —— بہت دور —— چلا جاؤں —— تم میرے حالات سے اچھی طرح واقف ہو —— لیکن اب تو بچیا! میری بی بی بھی ادیبہ بن بیٹھی ہے —— تڑاق پٹاخ جواب دیتی ہے —— اس سے کسی طرح بھی جیتنا سہل نہیں وہ تو ذہانت کی پھلجھڑی ہے —— میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس آگ کی ڈلی سے دور

چلا جاؤں ـــ تاکہ اپنے دامن کو آگ لگنے سے بچا لوں اور
چین کی زندگی بسر کر سکوں ـــ اب میری سوئی ہوئی
غیرت جاگ اٹھی ہے ـــ اب میرا یہاں رہنا مشکل
ہی نہیں ۔ بلکہ ناممکن بھی ـــ اور امید ہے کہ تم بھی
میری مشکل کو نہ دیکھ پاؤ گے" ـــ

جواب دینے کی بجائے چھتے کی پلکوں پر لرزتے ہوئے اور ڈھلکتے ہوئے آنسو اس سوچ میں گم تھے ـــ کہ آج میرے سامنے وہ انسان حقیر سکوں کے لئے ہاتھ پھیلا رہا ہے ـــ جس نے ہمیشہ زندگی کے سفر میں میری رہنمائی کی ـــ جس کے کئی سال اس معاشرے سے الجھتے ہوئے بیت گئے ـــ جو اپنے قلم کی تلوار جیسی نوک سے ماحول کے زخموں کو کریدتا رہا ـــ مگر اس کی بیچارگی اس کے لئے مرہم مہیا نہیں کر سکتی ـــ جس نے بھوک اور ننگی وحشتوں کو گھر کی چیزیں بیچ کر سہارا دیا ۔ جس نے گلیوں میں آوارہ پھرتے ہوئے گوشت کے آوارہ لوتھڑوں کو تہذیب و تمدن سے آشنا کیا ـــ جس کے لمحے زنداں و سلاسل کی سلاخوں سے کھیلتے رہے ۔ جھونپڑیوں میں ٹمٹماتے ہوئے دیئوں میں تیل کی جگہ اپنا لہو ڈالنے والا نادار ادیب ـــ اس بے کسی ـــ بے بسی اور بیچارگی میں ـــ کاش ! ـــ

"اچھا میں چلتا ہوں" ـــ خاک دہلوی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا" ـــ

ذرا ٹھہرو تو سہی بھیا ! چھتے کی بیوی نے کہا ! اور چکی کے نیچے سے زمین کے اندر سے ایک مٹی کا برتن نکالا اور چند کھنکتے ہوئے سکے اس کے ہاتھ میں دھر دیئے ـــ جو اپنی ہی آگ میں جلا کر [illegible] تھے ـــ

وہ اسٹیشن پر پہنچ کر ایک لمبی سی قطار میں کھڑا رہا ـــ کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا ـــ کھڑکی تک پہنچنے میں چند لمحے باقی تھے ـــ اور اس کے ذہن کی گہرائی میں یادوں ، زمانے کے ستم ، اور ماحول کی خرابی کا ملا جلا ابال اٹھ رہا تھا ـــ ادب ـــ افلاس ـــ معاشرہ ـــ اور ماحول ـــ کی تصویریں یکے بعد دیگرے اسے دکھائی دیتی رہیں ـــ

نفرت و محبت کے تاثرات کا اتار چڑھاؤ ـــ چہرے پر اپنا تسلط قائم کیے ہوئے تھا ـــ فکر اور تفکرات نے اس کے چہرے پر دبیز جھریوں کا جال بُن دیا ـــ اور ہر ایسے خیال سے اس کے ذہن پر نا امیدی اور مایوسی کے ہاتھوں ایک اور خراش پڑ جاتی ـــ

ـــ "کدھر جانا ہے" ـــ ؟ ٹکٹ بابو کی آواز نے اسے چونکا دیا ـــ جواب دینے سے پیشتر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ جیب سے دوسری طرف صاف جا نکلا ـــ

ٹکٹ بابو کی کھڑکی کے ماتھے پر (جیب کتروں سے ہوشیار رہیئے) کا سائن بورڈ اس کا منہ چڑا رہا تھا ـــ اور لوگوں کے بلند بانگ قہقہے فضا میں اس طرح گھل رہے تھے ، جیسے کسی کی کھوکھلی عصمت کی چتا کا دھواں خلاؤں میں گھلتا ہے ـــ

دھواں ـــ اور ـــ قہقہے ـــ

اخلاص تو کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کم بخت مسلسل ہو تو کافر کر دے
جوش

طنزیہ

لطف الرحمن محمود

ضرورت رشتہ

نہایت دقت سے افادۂ عوام کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ ایک مریل نوجوان کے لئے مبلغ ایک عدد صحت مند خاتون کی اشد ضرورت ہے۔ جو ازدواجی تعلقات کے نازک دھاگوں میں اسیر ہونے پر بلا جبر و اکراہ آمادہ ہو۔ صحت مند کی قید اس لئے ہے کہ مریل نوجوان کو صحت کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے صحت بخش خاتون کا ہونا لازمی ہے۔ نوجوان مذکور کے کوائف پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اگرچہ۔ ع۔ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

پھر بھی اعلان چونکہ اخباری نوعیت کا ہے۔ اس لئے ہم اس بحرِ بیکراں کو کسی آوے سے برآمد شدہ کچے کوزے میں ہی بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نوجوان مذکور عرصۂ دراز سے "کالج لائف" سے وابستہ لغویب رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کالج میں داخل ہونے کا مقصد کسی "ڈگری" کا حصول نہیں بلکہ محض لطف اندوز ہونا مقصود ہے۔ اب تو طالب علم مذکور کا یہ حال ہے کہ ڈگری کے حصول پر ڈگری ہو جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ کالج لائف سے لطف اندوز ہوتے ہوتے جائیداد کا ایک معقول حصہ "فیسوں اور جرمانوں" کی شکل میں کالج اور یونیورسٹی کو دیا جا چکا ہے۔ اسطرح حاتم طائی کی قبر پر کلاسیکل لاتیں جھاڑنے کے بعد اب باقیماندہ جائیداد کے تحفظ اور بقا کے لئے شادی رچانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہی غم ضرورت مند کو کھائے جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے کوئی اور غم لاگو ہونے نہیں دیا۔

حتیٰ کہ ڈاکٹری مشورہ کے تحت اس نے ڈگری کا غم بھی لاحق کرنا گوارا نہیں کیا۔ اگرچہ نوجوان مذکور نے متعدد امتحانات دیئے ہیں۔ مگر فی الحال اس کے پاس کوئی ڈگری موجود نہیں ہے۔ البتہ اُس کے پاس فرسٹ کلاس میٹریکولیٹ ہونے کی جعلی سند ضرور موجود ہے۔ جسے دل بہلانے کے لئے فریم کروا کے چھت سے لگوا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کیریکٹر سارٹیفکیٹ ایک پلندہ کی صورت میں تھانے میں بھی موجود ہیں۔

امیدوار کی تعلیمی قابلیت

ازدواجی تعلقات کے خواہشمند امیدوار کے لئے پی ایچ ڈی یا کم از کم ایم۔اے ہونا ضروری ہے ایم۔اے میں تھرڈ کلاس والے امیدوار بے شک تکلیف نہ کریں۔ مخصوص حالات میں اس قید میں ذرا ڈھیل دے کر بی اے آنرز تک دائرہ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ ایم بی بی ایس کے ساتھ تو ترجیحی سلوک کیا جائے گا۔ لیکن نفسیات اور فلسفہ کا ایم اے امیدوار اگر معاف رکھے تو کرم بالائے کرم ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوان مذکور دنیا میں کچھ سانس لینا چاہتا ہے زندگی اجیرن بنوانے اور ناک میں دم کروانے کے لئے شادی نہیں کی جاتی!! - ایم بی بی ایس کے ساتھ اس لئے ترجیحی سلوک کیا جائے گا۔ تاکہ نوجوان مذکور کا حصول صحت کا پانچ سالہ پلان بھی تکمیل پذیر ہو سکے۔ تعلیمی معیار صرف اس لئے بلند رکھا گیا ہے کہ صحت کے منصوبہ

کی تکمیل کے بعد ترقی تسلیم کے دس سالہ پلان پر عمل
شروع ہوگا ـــ ایسی خیر خواہ خاتون کی کھوج کی
جائے گی ۔ جو ایک کثیر جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کی
مالکہ ہوگی ـــ محترمہ کے لئے ذات پات ۔ خاندان
علاقہ ۔ آب و ہوا ۔ ضلع ۔ صوبہ ۔ ملک ۔ بر اعظم کی
کوئی قید نہیں ۔ البتہ روسی بلاک سے تعلق رکھنا
قابل اعتراض ہوگا ۔ اسی طرح عمر ۔ قد ۔ بُت ۔ صورت
اور سیرت کی کوئی قید نہیں ۔ امیدوار کے لئے
البتہ خاتون ہونا ضروری ہے ۔ سیکس تبدیل
ہونے کے بعد خواتین کا لقب پانے والے امیدواروں
کو مفت خورے تصور کیا جائے گا ۔ اور اگر
درخواست دی تو ازالہ حیثیت عرفی کا کیس
کردیا جائے گا ! امیدواروں کو صورت اور
سیرت کی اسناد کی مصدقہ نقول پیش کرنے
کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اور نہ ہی کسی گاؤن وغیرہ
کی خاص ضرورت ہے ۔ البتہ کالے برقعہ کی بجائے
"شٹل کاک" برقعہ زیادہ موزوں سمجھا جائے
گا ۔ کیونکہ کپڑے کی دکانوں سے تھان چرا کر لانے
کی گنجائش نسبتاً زیادہ ہوتی ہے ۔ البتہ چند
لازمی امور میں امیدوار کا ماہر ہونا ضروری ہے
بار بار فیل ہونے کے طفیل "حلقۂ ارباب ذوق"
چونکہ وسیع ہوچکا ہے ۔ اس لئے نوجوان مذکور
کو دور کی سوجھی ہے ۔ یعنی انتخاب فرمانے کی ۔
اس لئے تعارف کے حلقہ کو وسیع تر کرنے کیلئے
امیدوار کو جلسوں کی صدارت کرنے اور انتخابی
مہمات میں تقاریر کرنے کا تجربہ ہونا چاہیئے ۔
امور خانہ داری سے ناواقفیت قابل برداشت
ہوگی ۔ البتہ میک اپ کے سلسلہ میں کسی بھول
[illegible]

یہ آسامی نہ عارضی ہے نہ مستقل ۔ امیدوار کے متعلق
حتمی رائے قائم کرنے کے بعد آسامی کی نوعیت
کے متعلق ایک وضاحتی بیان بعد میں جاری کیا
جائے گا ۔

تنخواہ ـــ بعض شر پسندوں نے یہ بے پر کی
اڑائی ہے کہ نوجوان مذکور داستاں کے اس
قول کا قائل ہے کہ " مرد تو شادی اس لئے
کرتے ہیں کہ رسوئیا ۔ کہار کو تنخواہ نہ دینی
پڑے ـــ " یہ بالکل بے بنیاد الزام ہے ۔
معقول تنخواہ کے علاوہ ۔ مہنگائی الاؤنس ۔
میک اپ الاؤنس ۔ لانڈری ہیل لفٹی الاؤنس
ـــ دیگرہ وغیرہ ۔ کئی قسم کے الاؤنس دیئے
جائیں گے ۔

فرائض ـــ اعلان میں کہیں کہیں فرائض اور
امور خانہ داری پر روشنی ڈالی جا چکی ہے ۔
البتہ پروگرام یہ ہے کہ ابتدائی ترقیاتی منصوبوں
کی تکمیل کے بعد نوجوان مذکور ملازمت کے لئے
رینگنا شروع کر دے گا ۔ اس سلسلے میں محترمہ
کو درخواستیں لکھنا پڑیں گی ۔ اگر ملازمت مل گئی
تو سارا دن دفتروں میں معمے حل کئے جائیں گے
اس کار خیر میں بھی اہلیہ کی تنقیدی بحث ضروری
ہوگی ۔ اگر ملازمت نہ ملی تو اس کچی دال کو صحافت
کے چولہے پر چڑھا دیا جائے گا ۔ یعنی ایک ادبی
پرچہ بنام " شادی خانہ بربادی " جاری کیا جائے
گا ۔ مگر اس رسالہ کا پیٹ بھرنے کے لئے ادبی
ایندھن محترمہ کو تیار کرنا ہوگا ۔ خصوصاً باورچی
خانہ میں بیٹھ کر " ایڈیٹر کے نام ڈاک " والے تمام
خطوط خود تصنیف کرنے پڑیں گے ـــ
آخر ہے کہ رسالہ جاری نکلے گا ۔ اگر یہ داؤ بھی نہ چلا

تو پھر سیاسیات میں حصہ لیا جائے۔ نوجوان مذکور کے ہم مکتبوں اور خیر اندیشوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کامیاب ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ محترمہ کو تقریریں لکھ کر دینا ہوں گی۔ مختلف جلسوں میں اُس کے ہمراہ جا کر اُس کی قدر و قیمت (VALUE) بڑھانے کا فرض بھی ادا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ثقافتی جلسوں کی صدارت بھی کرنی پڑے گی۔

قریبی حلقوں کو معلوم ہوا ہے کہ نوجوان کے اخلاقی پہلوؤں کو اُجاگر نہ کرنے کی عالمگیر مہم چلا دی گئی ہے۔ ہم نہایت واشگاف الفاظ میں اس عامیانہ و سوقیانہ رَوش کی مذمت کرتے ہیں۔ مختصراً واضح ہو کہ نوجوان اعلیٰ درجہ کا شریف انسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کا تعلق شرفاء کے خاندان سے ہے۔ مگر چونکہ اس ایٹمی دور سے متعلق ہے۔ اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر شرافت کو استعمال نہیں کرتا۔ تاکہ اُس وقت یہ لیبل کام آسکے۔ مذہب کی اگرچہ قید نہیں مگر ضرورت مند پیدائشی طور پر تو مسلمان ہے۔ بس اُس کا نام مسلمانوں جیسا ہے مگر اس کا تخلص ہندوں جیسا اور کُنیت عیسائیوں جیسی ہے۔ البتہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کیوں مسلمان ہے؟ گر بچہ مسلمان ہی ــــ اُس کے اعمال کی وجہ سے عوام الناس اُسے یہود اور نصاریٰ گردانتے ہیں۔ مگر اس نے تو مسلمانوں کے گھر آنکھیں کھولی ہیں۔ وہ کیسے یہود و نصاریٰ میں سے ہو سکتا ہے؟ نوجوان کی شکل تو بڑی حد تک انسانوں سے ملتی جلتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ انسانی جلد بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا گورے رنگ پہ بھروسہ نہیں ہے۔ امیدوار کے ذوقِ حُسن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کے کمرے میں میک اَپ کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ فی الحال کسی فلم کا "ہیرو" معلوم ہوتا ہے۔ جو کسی انتہائی

بیمار کا پارٹ ادا کرتا ہو۔ ضرورت مند کی شکل چونکہ راکٹ سے مشابہ ہے۔ اس لئے کبھی کبھی "مصنوعی سیارہ" بن کر خلمی دنیا کے کسی چاند کی تسخیر کے لئے اڑنے لگتا ہے۔ مگر اکثر اوقات ابتدائی امریکی سیاروں کی طرح اُڑتے ہی زمیں بوس ہو جاتا ہے اور اس طرح ٹیں ٹیاں بول جاتا ہے ــــ ضرورت مند کی ہر دلعزیزی اور حلقۂ ارادت کی وُسعت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سر گنگارام ہسپتال کے شعبہ امراض خبیثہ کے انچارج ڈاکٹر غزنوی سے لے کر "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" والے حکیم غلام احمد تک دوستانہ مراسم اور تجارتی تعلقات استوار ہیں۔ اور آئے دن نسخوں اور دواؤں کے مشورے ہوتے رہتے ہیں۔ تمام ماہرین صحت سے ضرورت مند کی دوستی ہے۔ تعلیمی مصارف کے بعد بجٹ میں سب سے زیادہ گنجائش اس طبقے کی بہبود کے لئے رکھی گئی ہے۔ جہاں تک محبوب مشغلوں کا تعلق ہے۔ ضرورت مند کے ان گنت مشاغل ہیں۔ سیگرٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑوں کا عجائب خانہ تیار کرنا خربوزوں کے چھلکوں سے دوائیں بنانا ــــ خلمی لباس کو اپنانا ــــ یتامیٰ اور مساکین کی طرح گردن پر بال بڑھا کر رکھنا ــــ پان نوش فرما کر ہونٹوں کی قوسیں لال کرنا ــــ گھر سے نکلتے وقت گالوں پر طمانچے مار کر دوران خون کی نہروں کا افتتاح کرنا! ــ وغیرہ سب ضرورت مند کے محبوب مشاغل ہیں! ــ

طرزِ امتحان: ــ امیدوار کا ایک امتحان لیا جائے گا۔ سب سے پہلے تو ایک سرسری انٹرویو ہوگا اس میں کامیاب ہونے والے امیدوار صرف تحریری امتحان میں بیٹھنے کے مجاز ہوں گے۔ اس کے بعد دو عملی امتحانات ہوں گے ــــ ایک میں میک اپ کے انداز کی ٹیسٹ کیا جائے گا۔ اور دوسرے

میں دعوتوں میں "مرکزِ ثقل" بننے کی صلاحیت" کا جائزہ لیا جائے گا۔ ثقافتی جلسوں کی صدارت کے علاوہ حصہ لینے کو بھی جانچا جائے گا۔ ایسے اجتماعات اور دعوتوں میں جب فوٹوگرافر کیمرے کی آنکھ اوپر کرے تو محترمہ کا فرض ہوگا کہ وہ جھٹ دوڑ کر میزبان کے ساتھ ایستادہ ہو جائے۔ اگر وہ اس کے برعکس شوہر کے پاس ہی کھڑی رہی تو غضب ہو جائیگا اخبارات میں اُس جوڑے کی پس ماندگی اور جاہلیت پر اداریے لکھے جائیں گے۔ اس صورت میں ـــ

"میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا"

کے مضمون کا نوٹس دے کے فوراً علیحدہ کر دیا جائیگا

ایسی تمام درخواستیں ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی معرفت آنی چاہئیں۔ درخواست آنے پر مطبوعہ فارم بھیجے جائیں گے۔ آنے جانے کا کرایہ اُس زرِ ضمانت سے ادا کیا جائے گا۔ جسے امیدوار کنگال بینک لیمٹڈ ... میں جمع کرائیں گے۔ قیام وطعام کے سلسلہ میں متعدد گداگروں کی پیشہ ورانہ خدمات مستعار لی گئیں۔ اقربا نوازی کی لعنت کو ختم کرنے کے لئے ضرورت مند کے شادی کمیشن کے ارکان نے فیصلہ کیا ہے جس کی رو سے اور کئی ضرورتمند کے خاندان کے افراد درخواست بھیجنے کے حقوق سے بالکل محروم کئے جا چکے ہیں۔ ان تمام امیدواروں کا انٹرویو سر گنگارام ہسپتال میں ہی ہوگا۔ ان تمام "ٹنڈر نوٹسوں" کو ہواؤں کے منتخب شدہ نمائندوں کے سامنے کھولا جائے گا۔ جن فارموں کے ہمراہ کنگال بینک کی بجائے بنگال بینک یا کسی اور بینک کی رسید منسلک ہوگی۔ اُس کو رد کر دیا جائے گا۔ یہ انتخاب عام محکمانہ انتخاب سے قدرے مختلف ہے

آسامی پُر کرنے کے بعد "ضرورت ہے" کا اشتہار نہیں دیا گیا۔ بلکہ فی الحال اس آسامی کے لئے کوئی امیدوار منتخب نہیں کیا گیا۔ خاص حالات میں تعداد میں اضافہ کی گنجائش ہے۔

انتخاب کے بعد تمام درخواستوں کو ردی کے بھاؤ بیچنے سے قبل کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ اور اُس کے نسخے تمام ہسپتالوں لائبریریوں ـــ مستورات کے اداروں۔ حکیموں اور عدالتوں کو بھجوائے جائیں گے ردی سے جو زرِ کثیر حاصل ہوگا۔ اس سے ناکام امیدواروں یعنی "شہداء" کی یادگار قائم کی جائے گی۔ جس کا نقشہ بیرونی ماہرین تقریباً دس سال میں پیش کریں گے۔ اس عمارت کو بعد ازاں کرایہ پر دے دیا جائے گا۔ اور آمدنی سے ناکام امیدواروں کی تاحیات پنشن جاری کر دی جائے گی۔ تشریح طلب امور کے لئے ڈاک کے ٹکٹ یا جوابی لفافہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ مطلوبہ سوالات کے جوابات مقامی اخبار "گدائے پاکستان" کے کالموں میں شائع کئے جائیں گے۔ نتیجے کی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

نوٹ:- یہ مضمون محض معاشرتی نقائص پر ایک لطیف سی طنز ہے۔ لہٰذا اسے حقیقت پر محمول نہ کیا جائے۔

تمہارا غم تو بن گیا فروغِ رنگِ زندگی
گلہ نہیں شباب اگر طرارۂ بہار تھا

ظہیر کاشمیری

چشم بد دور!

قارئین کرام! یہ کالم ہم نے اپنے خاص کرم فرماؤں کے ذکرِ عالی فکر کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اس مستقل کالم میں صرف اُن تخلیقات کے نادر نمونے پیش کئے جائیں گے۔ ہماری بدبختی کی وجہ سے جن سے گذشتہ صفحات کی عظمت کو چار چاند نہیں لگ سکے ہیں۔ یعنی جن کی باضابطہ شرکتِ اشاعت سے ہمارا رسالہ محروم رہا ہے! محروم رہنے کی وجہ؟ اس نقصان پر آپ کا یہی سوال ہوگا ـــ سو سادہ مثال سے واضح ہو کہ جس طرح اگر غریب آدمی مُرغّن غذا کھائے تو اُسے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اگر ایک عام جریدہ ذرا زیادہ بلند پایہ ادب پارے شائع کرے تو اُسے قبض ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بے چارا چل پھر نہیں سکتا ـــ عجب مشکل تھی یہ مسئلہ درپیش تھا۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی یہ ذرا زیادہ بلند پایہ تخلیقات بھی شریکِ اشاعت ہو جائیں اور قبض بھی نہ ہو۔ کیسے حل ہو؟ آخر کار ع۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے ـــ حکیمِ عقل نے اس کالم کا نسخہ مرحمت فرمایا۔ جسے ہم پہلے تجربہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں یہ اسراف محض شاعرانِ نو کی حوصلہ افزائی کے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ دلوں کے نازک آبگینوں ـــ اور وہ بھی حساس شعراء کے ـــ کو توڑنا ایک وحشیانہ بربریت ہے یہ کالم ایسے ٹوٹے ہوئے آبگینوں کی شیشہ گری کے لئے محض فی سبیل اللہ وقف ہوگا۔ چونکہ اُس کی بنیادی اینٹ ہی خدمتِ خلق کا جذبہ ہے۔ اس لئے ع کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما۔ پر ہمیں ایمان ہے اور یقین کرتے ہیں کہ اس کالم کو کبھی فاقہ نہ ہوگا بلکہ یاوہ گوئی کے طفیل ایک لنگر بن جائے گا۔!

کئی حساس قسم کے حضرات یہ خیال ظاہر کر سکتے ہیں کہ سارا ڈھونگ محض تضحیک کے لئے رَچایا گیا ہے۔ واضح ہو کہ ایسا الزام ہماری رُوح پر فتوح کو تکلیف دہ بچھو کے لگانے کے مترادف ہوگا۔ جو کالم صرف آپ کی دیرینہ خواہشات کے احترام کے لئے وقف ہے۔ جس کا اجرا ہی محض آپ کی حوصلہ افزائی کے لئے ہوا ـــ اس کی تہ میں تضحیک کا عامیانہ عنصر کیسے مضمر و مستتر ہو سکتا ہے؟ عقلِ انسانی یہ بات تسلیم نہیں کر سکتی!! ہمیں سو فیصدی یقین ہے کہ اس کالم کی ہر دلعزیزی کی وجہ سے ہمارے لئے جمع شدہ مواد کے انبار سے مستحقین کے فن پاروں کا انتخاب مشکل ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ اس کالم میں صرف وہ فن پارے شائع ہو سکیں گے۔ جن کی بلندیٔ تخیل اور رفعتِ خیالات کا بوجھ ہماری عقلِ نارسا کے کمزور ترازو کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے گا ـــ اس لئے آپ اس کالم کو عجائب و غرائب کا کالم تصور کر سکتے ہیں چونکہ کسی قسم کی تضحیک قطعاً مراد نہیں۔ اس لئے آپ کے اشتیاق کے پیشِ نظر ہم تخلیقات کے ساتھ

ساتھ ان کے فاضل مصنفین کے اسماء گرامی کا بھی اعلان کریں گے ـــــ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ان کے حق میں سچے دل سے دعائے خیر فرماویں!

جناب "ریحان ۔ ناصر ۔ محمود" ایک شاعر ہیں بلکہ شاعری کا "مکتب" ہیں ۔ کیونکہ ریحان ۔ ناصر محمود یہ سب ان کے تخلص ہیں ۔ شاید اصل نام بھی یہی ہو ۔ خیر ۔ شاعر تو ہیں ہی ۔ لیکن ہیں ذرا نئے ۔ مگر انھوں نے جو غزلیں ہمیں مرحمت فرمائی ہیں ۔ وہ یا تو پرانی ہیں یا پھر بہت ہی تازہ ہیں! غزلیں جاری درخواست پر رسالہ کی زینت دوبالا کرنے کے لئے عطا ہوئی تھیں ۔ انھوں نے مشورہ بھی طلب فرمایا تھا ۔ الحمدللہ کہ رسالہ کی زینت دوبالا بلکہ "چو بالا" ہو رہی ہے ۔ باقی رہا مشورہ ۔ سو عرض ہے کہ "ادارہ" اس کرم فرمائی پر ان کا ممنون احسان ہے اور آئندہ بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کالم کے لئے ضرور غزلیں مرحمت فرما کر اہل ادب پر احسان عظیم کی روشنی جاری رکھیں گے ۔ البتہ انہیں ارسال کردہ غزلوں کی نقول عجائب گھروں کو بھیجنے کے لئے اپنے پاس میں ضرور محفوظ رکھنی چاہئیں ۔!

ساری غزلیں درج کرنے سے تو یہ کالم "غزل المتفرقات" بن جائے گا ۔ اسلئے صرف نوادر پر اکتفا کیا جائیگا ۔

اگر تم آئے دیر سے تو ہم انتظار کرلیں گے
اگر تم مل گئے ہم کو تو ہم نیّا پار کرلیں گے
اگر چھوڑا تم نے راستے میں ہمیں ـــ
تو ہم تیرے بغیر قرار کرلیں گے
نہ کر تو ہمیں اس طرح بیداد نظر سے
ہم تو پہلے ہی بیداد ہیں زخموں سے پیار کرلیں گے
ملا نہ ہمیں گر کوئی تجھ جیسا پیارے
تو ہم [illegible]

جو تم نہ آئے تربت پہ مرجانے کے بعد
تو پھر جنت میں ہم تمہارا انتظار کرلیں گے

خدا کا شکر ہے انہیں یہ شعر نہیں سوجھا ۔

اے قاصد تو جا کہدے الہ آباد کے ایڈیٹر سے
گر غزل میری نہ چھاپی تو ہم گرفتار کرلیں گے

دوسری غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔ مطلع ہے ۔

تیری اس ادائے ناز نے بے گانہ کر دیا
میں پہلے ہی بے ہوش تھا اب اور کر دیا

پھر فرماتے ہیں ۔

میں تیری یاد میں پگھل رہا ہوں اے پیارے
میں پہلے ہی نشہ میں تھا اب اور کر دیا
تو اگر بھول گیا ہے مجھے اے خوش نصیب
میں پہلے ہی فراموش تھا اب اور کر دیا
آنکھیں ترس گئی ہیں تجھے بغور دیکھنے کے لئے
میں پہلے ہی غمگیں تھا اب اور کر دیا!

دیکھئے لفظ "بغور" نے جان پیدا کر دی ہے ـــ!

دے دینا قاصد میرا یہ پیغام انہیں
میں پہلے ہی بدنصیب تھا اب اور کر دیا

مقطع میں تو وہ خیال ہے باندھا ۔ وہ غالب ۔ مومن ذوق ۔ آتش ۔ داغ وغیرہ ۔ اگر مل کر بھی باندھتے تب بھی ناممکن تھا ـــ یہ لوگ اگر زندہ ہوتے تو مقطع سنتے ہی بخدا کپڑے پھاڑ کر جنگلوں کو نکل جاتے ـــ

نہیں تجھ سے گلہ ناصر ریحان بدنصیب کو
بگڑا نصیب میرا ہے اب اور کر دیا

خاکسار کے ایک برادر عزیز ہیں ۔ پہلے تو اُن کا دماغ ٹھیک تھا ۔ مگر جب یہ کالم لکھا جا رہا تھا تو انہیں بیٹھے بٹھائے کچھ خیال آیا ۔ خیال کیا آیا

جلال آیا جھٹ ایک "نظم" لکھ ماری۔ ہم نے نظم
دیکھی تو مارے "وجد" کے ہمارے ہاتھ پاؤں
پھول گئے۔ پاس پڑی ہوئی ڈکٹ سے اس
ادب نوازی پر اُن کی مرمت کی اور ٹھکائی کے
بعد جب خمارِ شاعری اترا، اور انہوں نے توبہ
فرمائی۔ تب ہماری جان میں جان آئی ہے ۔۔۔
صرف ابتدائی شعر ملاحظہ ہوں۔ کیا ہم "داد"
دینے میں بھی حق بجانب نہیں تھے؟

نئے ستارے نکل آئے (عنوان)

ہوا غروب آفتاب
کثف بھی دکھائی دینے لگے
جب اندھیرے نے زور ڈالا
تو چاند نے بھی سر نکالا

اور اگلا شعر شاید برادر عزیز نے ہمارے قد
کی مناسبت سے ذرا لمبا کر دیا ہے ؎

گئیں تاریکیاں دور اس جگہ آئی روشنی
گرمی کی شدت سے میدان اور ٹھنڈے ہوگئے

پھر اگلا "شعر" خدا جانے کیوں یک لخت سکڑ گیا

؎ اتنے میں دیکھا کہ تاروں کے جال
نکل آئے کچھ ستارے ہیں کمال

وغیرہ ۔۔۔

یہ تو خیر بحر تھے۔ اور اسی پر طرہ یہ کہ بحور و قیود
کے ہاتھوں مجبور و معذور تھے۔ مگر آزاد نظم میں
تو تخیل قطعاً مقید نہیں ہوتا۔ ہمیں اس دفعہ
یوں تو کئی آزاد نظمیں موصول ہوئی ہیں
اُن میں سے ایک زیادہ بلند پایہ نظم نے گذشتہ
صفحات کی بجائے ان صفحات کو ترجیح دی
ہے۔ حروف ابجد کے لحاظ سے شاعر نے
اپنا نام "ع۔ ب" لکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں
کہ "ع۔ ب" کون صاحب ہیں۔ شاید انہوں نے
اپنا نام صرف اس لئے اختصار سے لکھا ہے
کہ مبادا صحیح نام لکھنے کے بعد انہیں مبارکباد
کے خطوط نہ آنے لگ جائیں ۔ لہذا ہم بھی
"ستاری" ہی کرتے ہیں ۔۔۔ فاضل مصنف
حلقۂ "ارباب ذوق" سے متعلق ہیں۔ ایک دن
بزم میں "منظوم تراجم" پر بات چل نکلی۔ ان
حضرت نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ ایک
"ضخیم نظم" تصنیف فرما دی۔ جب ہم نے
اسے سونگھا۔ تو درخواست کی۔ کہ المنار
کے لئے مرحمت ہو تو ثواب ہی ثواب ہے
مگر وہ تو "ماہ نو" ایسے بلند پرچے میں بھی
شائع کرانے پر آمادہ نہ تھے ۔۔۔ خیر ہم
نے ان کے ہاتھ اور اپنے پیر جوڑ کر یہ نظم
حاصل کر ہی لی۔ شاید طائرِ تخیل اس وقت
راکٹ کی رفتار سے محو پرواز تھا۔ ساحل
سمندر کے نظاروں سے متاثر ہو کر یہ نظم
لکھ گئی ہے۔ بطور "تبرک" چند شعر ملاحظہ ہوں

کاٹ دو چٹانوں کو
کاٹ دو ٹھہرو اسے پھرو کاٹ دو!
دیکھو نا ذرا کاٹ دو ٹھہرو
کاٹ دو سمندر کی ٹھٹھرتی ہوئی سفید چٹانوں کو
مگر چٹانیں اور وہ بھی سفید سفید، کہاں
سے آگئی ہیں اس سمندر میں
مگر کاٹ دو کاٹ دو اسے پھرو! ان چٹانوں کو
ممکن ہوا تو باندھوں گا الفاظ میں ان خیالوں کو
مگر پہلے تم اسے پھرو کاٹ دو ان چٹانوں کو
پھر میں باندھوں گا الفاظ میں ان خیالوں کو!

سمندر میں تو مد و جزر ہوتا ہی رہتا ہے مگر

اب شاید جزر ہے کیونکہ مصرعے ٹکڑنے شروع ہوگئے ہیں۔

آہا اے ماہی گیر کے بچے   تو بلاتا ہے چلاتا ہے
اپنی ننھی بہن کو

اب غالباً مد ہے کیونکہ مصرعے لمبے ہونے شروع ہوگئے ہیں

مگر سناتا ہے مجھ کو اے ماہی گیر کے بچے
تو بلاتا ہے تاکہ کھیل سکے ساتھ اس کے بیچ سمندر
اور وہ تھا ماہی گیر اب تو بتا اے ملاح کے بچے لہروں کے
ارے تو گاتا ہے بیچ سمندر لہروں میں
کاٹ دو کاٹ دو اے لہرو ——
اے سمندر کی تند لہرو کاٹ دو کاٹ دو ان خیالوں کو
ورنہ میں نہ باندھوں گا الفاظ میں ان خیالوں کو!

ہم اسی پر ہی اکتفا کرتے ہیں ورنہ یہ نظم ابھی باقی ہے اور دیگر "ملوک الشعراء" کی منظومات کا پلندہ بھی موجود ہے۔ ہم نے کہیں کہیں ارباب ذوق کا جلسہ منعقد کر کے ان نظموں کی نشر و اشاعت کا سامان کیا تھا کہیں اگر ایک مصرع بھی سنا دیا گیا تو داد کے ڈونگرے بے تحاشا برسے۔ اب ہم اپنی وساطت تمام حاصل شدہ داد حصہ وار تمام متعلقہ شعراء کی خدمت عالیہ میں اطلاعیہ پیش کرتے ہیں۔ الحمد للہ حق بحقدار رسید

اگر آج غالب زندہ ہوتے تو اس کالم کو پڑھ کر ان کو شادی مرگ ہو جاتی!

(اپنے اس محبوب کالم کو ہمیشہ یاد رکھئے)

اچھا۔ خدا حافظ!

بقیہ از ص ۳۹ "چور"

آج چھ برس گزر جانے کے بعد بھی یہ واقعہ مجھے یاد ہے اور اس کی یاد اگر قہقہے نہیں تو مسکراہٹیں ضرور لے آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اسے معمولی واقعہ سمجھیں مگر میرے ذہن میں آج بھی اسی طرح تازہ ہے جیسے ابھی ہی [illegible]

(۱)

نیوٹن ایک زبردست سائنسدان تھے انہوں نے فزکس اور ریاضی پر گراں قدر احسانات کئے ہیں۔ مگر ان کے دماغ پر اس کا اثر اس حد تک تھا کہ ایک دن ان کے ایک دوست نے دیکھا کہ انڈے کی بجائے گھڑی پکا رہے ہیں۔ انڈا ان کے ہاتھ میں تھا اور گھڑی فرائینگ پین میں!

(۲)

اسپین کے ایک کالج کے پرنسپل نے حکم دیا کہ کل سے ٹھیک نو بجے کالج کا صدر دروازہ بند کر دیا جائے۔ تاکہ دیر سے آنے والے طلبہ اندر داخل نہ ہوسکیں۔ اور عبرت حاصل کریں۔ دوسرے دن ٹھیک نو بجے دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور چند منٹ کے بعد پرنسپل کو معلوم ہوا کہ پچاس پروفیسر حضرات دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں ——

(۳)

ایک برطانوی طبی ادارہ نے تحقیقات کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ صرف کند ذہن لوگ سیگرٹ نوشی کرتے ہیں۔ اور ذہین آدمی سیگرٹ سے دور بھاگتے ہیں۔ اس ادارے نے ہزاروں سیگرٹ پینے والوں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ جو شخص زیادہ غبی ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ سیگرٹ نوشی کرتا ہے۔

دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

زندگی، واقعات اور حادثات کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ کالم اسی مجموعہ کے انتخاب کی ہلکی سی جھلک ہے زندگی میں کئی واقعات اس بے ساختگی سے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ناقابل فراموش بن کر ایک مستقل یاد کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہ کالم ایسے ہی دلچسپ واقعات کی اشاعت کے لئے مخصوص کیا گیا۔ آج ہی اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ قلمبند کیجئے اور دفتر المنار میں پہنچائیے۔!

(ادارہ)

"جلالی خنجر"

ایک دفعہ (بی۔ اے) کے امتحانات کے سلسلہ میں پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب کے ساتھ جھنگ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمیں رہائش کے لئے ایک اچھا سا مکان مل گیا ــــ ہم نے پرچے ایک محفوظ الماری میں رکھ کر مقفل کر دیئے ــ جب باہر جاتے تو کمرہ اور باہر والا دروازہ بھی مقفل کر دیتے ــ ایک دن جب شام کی روشنی رات کے دُھندلکوں سے گلے مل رہی تھی۔ میں امتحان سے فارغ ہو کر واپس آیا ــ سائیکل باہر رکھی ــ آگے بڑھا تو دیکھا کہ باہر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے ــ میری حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی ــ ایک سیکنڈ سوچ کر اندر داخل ہو گیا اور برآمدہ میں جا دھمکا ــ یقین جانیئے میرا دماغ پریشان خیالی کا آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ جب میں نے کمرے کا بھی ایک دروازہ کھلا ہوا دیکھا۔ لا متناہی خیالات نے جنم لیا ــ اور برق رفتاری سے دماغ کو جھلجھلیوں میں ڈال کر گذر گئے اور ساتھ ہی اس خیال کو تقویت بخش گئے۔ کہ آج ضرور کوئی پرچے لینے اندر داخل ہوا ہے۔ میں دو تین مرتبہ کھانسا کہ شاید کوئی باہر نکل آئے ــ مگر بے سود ــ اچانک کمرے کے دوسری طرف والے برآمدہ میں ایک سایہ دائیں سے بائیں لہراتا ہوا گزرا ــ خدا جھوٹ نہ بلائے ــ میں اب غصے سے تھرتھر کانپ رہا تھا ــ اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے ــ فوراً میں نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال کر اپنا خنجر بے نیام کر لیا اور جان ہتھیلی پر رکھ ــ مرنے یا مارنے کی قسم کھا کر ــ داخل ہوا اور سیدھا دروازہ کے پیچھے جھپٹا، مبادا کوئی ہو ــ مگر مکڑی کے جالے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اور تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا ــ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ــ خون کھولنے لگا ــ فوراً دوسرے برآمدہ کی طرف لپکا ــ کانپ ہی تو گیا۔ جب ایک شخص کو اپنا منہ گھٹنوں میں چھپائے، نیچی نظر کئے ہوئے ــ کچھ تلاش کرتے دیکھا ــ اس کو بوٹی بوٹی کر دینے کی خواہش نے آنکھوں پر پٹی باندھی ــ فوراً باز کی طرح جھپٹ کر اس کے لمبے لمبے بالوں کو اپنے فولادی پنجوں میں لے کر اس کا منہ اپنی طرف کیا اور جلالی چمکتا ہوا خنجر لہراتا ہوا ہوا میں بلند ہوا۔

اور قریب تھا کہ اس کے خون سے رنگیں ہوتا ۔۔۔ مگر اُف ۔۔۔! ۔شرم اور ندامت سے میری آنکھیں زمین ہی میں تو گڑ گئیں ۔جب اس شخص نے کہا ۔۔۔ "میں مکان والا ہوں ۔ اور ضروری ادویات لینے داخل ہوا ہوں"

خلیل کلیم خان

"سادگی"

ایک دفعہ سکول کے زمانہ میں ہمیں دو ماہ کی چھٹیاں ہونے والی تھیں ۔جن لڑکوں نے باہر جانا ہوتا ہے وہ کنسیشن (concessions) بنواتے ہیں ۔اس چیز کا انچارج ماسٹر صاحب نے اعلان کیا کہ جو لڑکے چھٹیوں میں باہر جانا چاہتے ہیں وہ کنسیشن بنوانے کے لئے مبلغ ۸ رجمع کرادیں ۔چنانچہ جن لڑکوں نے باہر جانا تھا انھوں نے ۸ ر کے حساب سے پیسے جمع کرا دیئے ۔ماسٹر صاحب ہر ایک لڑکے سے پوچھتے تھے کہ تم نے کہاں جانا ہے؟ تم نے کہاں جانا ہے؟ اسی اثنا میں دو دیہاتی لڑکے بھی ماسٹر صاحب کے پاس آئے اور ۸ ر سامنے رکھ کر کہنے لگے ۔کہ ایہ لو! ماسٹر صاحب آٹھ آنے اور سانوں کوٹ امیر شاہ (ربوہ سے ڈیڑھ دو میل دور ایک گاؤں کا نام ہے ۔جہاں نہ ریل جاتی ہے اور نہ ہی بسیں) دا کنشیشن بنا دیو"

ماسٹر صاحب ان لڑکوں کی جہالت پر باوجود غصہ کے ہنس پڑے ۔ اور ہم لڑکوں کا تو کچھ نہ پوچھیے ہنس ہنس کے بُرا حال ہو گیا ۔تب جا کر ان لڑکوں کو سمجھ آئی ۔جب بھی کبھی یہ واقعہ یاد آجاتا ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے ۔

(شاہد احمد چوہدری سیکنڈ ایر)

"نمازِ فجر"

انٹر کے گزشتہ امتحانات کا دوسرا سیزن تھا صبح فزکس کا پرچہ تھا گو کامیابی کی توقع تو تھی مگر پھر بھی امتحان کے روایتی خوف سے حالت غیر ہونے لگتی ۔ امتحاں کے دنوں میں بھی میں اس توقع پر جلدی سو جاتا تھا ۔کہ شاید کبھی پرچہ ہی خواب میں نظر آجائے ۔ مگر ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا ۔مگر فزکس کے پرچہ کے دن قسمت جاگی مگر صد حیف کہ جاگتے ہی سو گئی وہ اس طرح کہ میں عالم خواب میں لاہور پہنچا ۔ سینٹ ہال گیا ۔کمروں میں گھسا الماریوں کو کھولا ۔ اور وہ پیکٹ بھی نکالا جس پر "PHYSICS A" لکھا تھا ۔ مگر جونہی کھولنے کا عزم کیا کہ دروازے پر دستک کے شور نے بیدار کر دیا ۔ مولانا شفیق کہہ رہے تھے ۔ "محمود فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے" ۔۔۔ اور میں اپنے لاشعور کی بد دیانتی اور پھر قدرت کے تحفظ پر حیران و پریشان اُٹھ کھڑا ہوا ۔ یہ واقعہ یوں تو فزکس کا نام سُنتے ہی یاد آتا ہے ۔ مگر امتحان کے دنوں میں تو کثرت سے یاد آتا ہے ۔

"بچپنا یا قربانی"

ہم خان برادران ذرا ذرا سے تھے ۔ ہونگے کوئی چار چار ، پانچ پانچ سال کے ۔۔۔ جب ہم نے عید پہ بکرا قربان ہوتے دیکھا ۔۔۔ نادان تو تھے ہی ۔۔۔ دونوں نے کہا کہ چلو ہم ایک دوسرے کو قربان کریں ۔۔۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور لٹا دیا کونے میں ۔

—— اور لگا گردن پر چھرا پھیرنے —— مگر جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے" —— بھائی نے ایسی چیخ ماری کہ ممی باورچی خانہ سے دوڑ کر آگئیں۔ اور یہ دیکھ کر کہ میں اُلٹا چھُرا پھیر رہا ہوں خدا کی قدرت پر حیران رہ گئیں اور درود سجدے ادا کئے —— اور ہماری گوشمالی کی اور خبردار کیا —— گو مدتِ مدید ہوئی مگر اس کی یاد اب تک ذہن پر کندہ ہے۔ خان کریم اللہ خان ناصر

"چور"

صحن میں چھوٹے بچے آنکھ مچولی کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے اور میں بڑی دلچسپی سے اُن کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ افضل، انور، مسعود، ناصر اور ننھی صفیہ، سبھی موجود تھے۔ اور اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ "چور" کون بنے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ صفیہ "چور" بنے گی۔ اور باقی سب کے چھپنے کے بعد اُنہیں ڈھونڈے گی —— کھیل شروع ہو گیا صفیہ نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ اور باقی سب چھپنے کے لئے موزوں جگہ تلاش کرنے لگے۔ میں چونکہ شروع سے ہی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس لئے میں نے انور کو بلایا اور اُسے ایک نہایت موزوں جگہ پر چھُپاتے ہوئے تاکید کر دی کہ وہ قطعاً کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے اُس کی اس جگہ پر موجودگی کا پتہ چل سکے۔

اس کے بعد میں نے صفیہ کو بلایا اور کہا کہ اگر ہمت ہے تو انور کو ڈھونڈو۔ صفیہ نے جب یہ چیلنج منظور کر لیا اور انور کو ڈھونڈنے لگی۔ لیکن کافی دیر تک کوشش کرنے پر بھی جب اُسے ناکامی ہوئی تو وہ کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگی جس کے ذریعہ انور کی جائے پناہ کا پتہ چلا کر اُسے پکڑا جا سکے تھا اُسے ایک تدبیر سُوجھی اور اُس نے بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا "انور بہت بزدل ہے۔ آج ایک چھوٹے سے لڑکے نے اُس کی پٹائی کر دی۔ انور گدھا ہے آج اسکول سے اُسے سزا بھی ملی" دراصل صفیہ کا مقصد انور کو اشتعال دلانا تھا۔ یعنی وہ مشتعل ہو کر کوئی جواب دے اور اس کا کوئی سُراغ مل سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت اصول کے خلاف تھی۔ لیکن میں خاموش رہا اور انور کی طرف سے اِس کے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگا۔

صفیہ نے کافی اوٹ پٹانگ باتیں انور کی طرف منسوب کیں۔ لیکن اُس نے "قطعاً" کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی کوئی ایسی حرکت کی جس سے اُس کا کوئی سراغ مل سکے۔ لیکن مجھے یہ خطرہ تھا کہ کہیں واقعی انور مشتعل ہو کر اپنی جگہ سے باہر آجائے یا کوئی جواب ہی نہ داغ دے۔ چنانچہ میں نے بھی بلند آواز سے کہا۔ "انور تسلی سے بیٹھے رہو صفیہ کی باتوں میں نہ آنا یہ تمہیں دھوکا دینا چاہتی ہے کوئی جواب نہ دینا" مگر انور کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا "میں جانتا ہوں یہ صفیہ بالکل بکواس کر رہی ہے آپ مطمئن رہیں میں اس کی بکواس کا کوئی جواب نہ دوں گا" ——

اور اس آواز پر چل کر صفیہ نے انور کو کپڑوں کی ایک خالی الماری میں جا پکڑا!۔ اور اس کے بعد کیا ہوا؟ کہ دونوں میں جنگِ عظیم چھڑ چکی تھی انور سخت غضبناک ہو کر کہہ رہا تھا۔ بتا تو سہی کہ کون گدھا ہے اور کون بزدل ہے اور صفیہ بے تحاشا ہنس رہی تھی ——

گلہائے رنگا رنگ

(۱) "میرے دوستو! دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں" ارسطاطالیس

(۲) "صرف نیک ہی نہ بنئے بلکہ کسی کے ساتھ نیکی کیجئے" تھوریو

(۳) "مصروف لوگوں کے پاس مصروف جسم بننے کا وقت نہیں" سوفٹ

(۴) "خاموشی سب سے آسان کام، اور سب سے زیادہ نفع بخش عادت ہے" ارسطاطالیس

(۵) حسن کامیاب ترین سفارش نامہ ہے" ،،

(۶) "موت کا باعث زندگی ہے" افلاطون

(۷) "ذہانت اور قابلیت عظیم الشان محلات اور کوٹھیوں میں نہیں بلکہ حقیر جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے پاس ہوتی ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قوم و ملک کے لیڈر اور دیگر مشاہیر ہمیشہ متوسط طبقہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں" ملٹن

(۸) "مجھے معلوم نہیں۔ میں دنیا کو کیوں دکھائی دیتا ہوں، لیکن اپنے خیال میں اس لڑکے کی مانند ہوں، جو ساحل سمندر پر سنگریزوں سے کھیل رہا ہو۔ درانحالیکہ صداقت کا عمیق سمندر اس کے سامنے جوں کا توں پڑا ہے" نیوٹن

(۹) "زندگی کے بہت سے تجربات اور آسائشات سے نہ صرف یہ کہ احتراز کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ وہ ارتقائے انسانی کی راہ میں مستقل رکاوٹ ہیں" تھورو

(۱۰) بعض لوگ اپنی ابتدائی عمر، زندگی کے آخری حصے کو خوشگوار بنانے پر صرف کرتے ہیں۔ لابروئیر

(۱۱) "مجھے انسان سے نفرت ہے کیونکہ میں خود کو بہترین انسانوں میں شمار کرتا ہوں اور مجھے علم ہے کہ میں کسقدر برا ہوں" سموئیل جانسن

(۱۲) " اکثر لوگ اپنے آپ کو حقیقی عظمت سے ہم کنار پانے کے لیئے تنہائی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں" جان ہاتھ فیلڈ

(۱۳) اگر زندگی کی راہ سے غم کے کانٹے چن لئے جائیں اور وہ سراپا گہوارۂ مسرت بن جائے

(۱۴) ـــ تو ایسی زندگی دوزخ سے بھی بدتر ہوگی" برنارڈ شا
"خوشی مستقلاً اور متواتر دھوکے کا نام ہے۔ سوفٹ

(۱۵) "مجھے ایک بستر اور کتاب دے دیجئے۔ میں ہر طرح سے خوش ہوں" پیرسل سمتھ

(۱۶) "تاریخ میں ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں جو کسی فلاسفر کی حقیقی خوشی پر شاہد ہو ـــ فلاسفر ہمیشہ خیال اور رومانی دنیاؤں میں رہتے ہیں" ایچ ایل منکین

(۱۷) "دوزخ محبت، دنیا اور اپنے آپ سے محبت کا مجموعہ ہے" سویڈن برگ

(۱۸) "شاعری جذبات کا اظہار نہیں بلکہ جذبات سے گریز ہے۔ یہ شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے" ٹی ایس ایلیٹ

(۱۹) "اب ہمارے پاس وہ قوت موجود ہے جس سے ہم خود کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں" آئن سٹائن